Phone : 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1963

حضرت عمرؓ سے ایک دن کسی نے پوچھا کہ مملکت کی آمدنی میں سے آپ کے لئے کسقدر لینا جائز ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ کپڑوں کے دو جوڑے۔ ایک جاڑے کا، دوسرا گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک احرام۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ، نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو ان کا حال، سو میرا حال۔

(لمعات اندر ملاحظہ فرمائیے)

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
پاک و ہند سے سالانہ ___ ۸ روپے
غیر ممالک سے سالانہ ___ ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
پاک و ہند سے
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر ۸۰۸۰۰
خط و کتابت کا پتہ: ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵-بی - گلبرگ - لاہور

جلد (۱۶) — ستمبر ۱۹۶۳ء — نمبر (۹)

فہرست مضامین

۱- لمعات ___ ۲

۲- حقائق و عبر ___ ۱۱

۳- انسان کے بنیادی حقوق ___ (محترم پرویز صاحب) ___ ۱۷

۴- مجلسِ اقبالؒ ___ ۴۱

۵- رجال اللہ ___ (محترم عبداللہ الاثری صاحب) ___ ۵۱

۶- سرسید کی اصلاحی کوششیں ___ (محترم شاہد حسین رزاقی صاحب) ___ ۵۷

۷- بچوں کا صفحہ ___ ۷۰

۸- رابطۂ باہمی ___ ۷۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

لمعات

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ

ربیع الاول کا بابرکت مہینہ اپنی ہزاروں سعادتوں کو ساتھ لئے گزر گیا۔ اس مہینے میں ملک کے گوشے گوشے میں عید میلاد النبیؐ کے جشن منائے گئے۔ حضورؐ کے نام لیواؤں نے مختلف طرق و انداز سے بارگاہِ رسالت میں خراجِ عقیدت وارادت پیش کیا۔ ان تقاریب میں حضورؐ کی سیرت طیبہ کے مختلف گوشوں کو لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہی ان تقاریب کا بنیادی مقصد ہے۔

سیرت نبی اکرمؐ سے متعلق جو کچھ ہماری کتب روایات و سیر میں آیا ہے اس میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن میں اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن حیاتِ مقدسہ کا ایک گوشہ ایسا ہے جس میں کسی کو کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ وہ سب کے نزدیک متفق علیہ ہے اور وہ گوشہ یہ ہے کہ

(۱) حضورؐ نے ساری زندگی میں ایک پیسہ بھی جمع نہیں کیا۔

(۲) آپؐ نے کوئی جائداد نہیں بنائی۔

(۳) نہ ہی حضورؐ نے اپنے پس ماندگان کے لئے کوئی ترکہ چھوڑا۔ جب حضورؐ کے پاس نہ جمع شدہ دولت تھی نہ کوئی ذاتی جائداد، تو پھر ترکہ چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (سنی بہرحال اس پر متفق ہیں)

حضورؐ کی زندگی کا یہ رُخ، مفلسی اور ناداری کی وجہ سے نہ تھا۔ اس زمانے میں بھی حضورؐ کی زندگی اسی انداز کی تھی جب ایک وسیع اور عریض سلطنت حضورؐ کے زیرِ نگیں تھی اور مدینہ میں زر و سیم کا سیلاب آ رہا تھا۔ نہ ہی یہ رُخ زندگی دنیا سے نفرت کی بنا پر تھا، اس لئے کہ دنیا سے نفرت، قرآن کریم کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ نیز جب حضورؐ نے اتنی وسیع سلطنت قائم کی، تو دنیا سے نفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ان حقائق کی روشنی میں ایک نہایت اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اور اسی سوال پر غور کرنے کے لئے ہم نے اس موضوع کو خصوصیت سے سامنے لانے کی ضرورت محسوس کی ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ جب ہمارا ایمان ہے کہ حضورؐ کی حیات طیبہ ہمارے لئے (از روئے قرآن) اسوۂ حسنہ — بہترین ماڈل — ہے تو پھر مسلمان، ہزار برس سے

جس نہج سے زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں، اس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ اس سے بھی اہم سوال یہ کہ جب اسلام کی صحیح اور سچی شکل وہ ہے جس کی مظہر حضورؐ کی حیاتِ طیبہ ہے، تو پھر یہ کہنا کس طرح صحیح ہوگا کہ "اسلام ہمیں اجازت دیتا ہے کہ ہم بے حد و نہایت دولت جمع کریں۔ جتنی جی چاہے جائدادیں کھڑی کر لیں۔ جتنے وسیع و عریض رقباتِ اراضی چاہیں اپنی ملکیت میں لیتے چلے جائیں" اور پھر اس دولت۔ جائداد اور زمین کو اس طرح ترکہ میں چھوڑیں کہ ہماری اولاد، پیدائش کے ساتھ ہی (بلا محنت و مشقت) ہزاروں روپے کی مالک بن جائے اور لاکھوں کی جائداد ان کے نام منتقل ہو جائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اسلام کی صحیح تعبیر کی مظہر خود نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ ہے تو پھر اسلام کا وہ نقشہ کس طرح صحیح قرار پا سکتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اور جسے "متفق علیہ" طور پر حق سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر اسلام کا یہ تصور حق پر مبنی ہے تو پھر حضورؐ کے سیرتِ مقدسہ کے متعلق کیا کہا جائے گا جو اسلام کے اس تصور کے خلاف ہے۔

یہ سوال بڑا اہم ہے اور گہرے غور و فکر کا محتاج۔

اس سلسلہ میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام کی تعلیم تو وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، لیکن حضورؐ کے لئے خصوصی احکام تھے جن کے مطابق آپ نے اس انداز کی زندگی بسر فرمائی۔ یہ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ حضورؐ کے لئے جس قدر خصوصی احکام تھے (جن کا اطلاق عام مسلمانوں پر نہیں ہوتا تھا) ان کا ذکر بالتصریح قرآن کریم میں کر دیا گیا ہے۔ (مثلاً یہ کہ حضورؐ کی ازواجِ مطہراتؓ، مومنین کے لئے بمنزلہ حقیقی ماؤں کے تھیں) قرآن کریم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ عام مسلمانوں کے لئے تو اس کی اجازت ہے کہ وہ جس قدر جی چاہے دولت جمع کریں اور جائدادیں بنائیں لیکن حضورؐ کو اس کی اجازت نہیں۔ نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا عام حکم تو وہی ہے جس پر مسلمان عمل کرتے چلے آرہے ہیں لیکن حضورؐ نے اپنے لئے از خود خاص نہج زندگی اختیار فرمایا تھا۔ اس تصور کی رو سے کئی ایک اشکال پیدا ہوتے ہیں جن کا حل نہیں مل سکتا۔ مثلاً یہ کہ

(۱) چونکہ حضورؐ کی زندگی کو دوسرے لوگوں کے لئے نمونہ بننا تھا اس لئے اگر حضورؐ کسی ذاتی ذوق اور رجحان کی بنا پر اپنے اوپر کوئی ایسی پابندی عائد کرنا چاہتے تھے جس کا حکم قرآن میں نہیں تھا تو حضورؐ کو اس سے روک دیا جاتا تھا۔ سورۂ تحریم میں دیکھئے حضورؐ کو کس شدت سے کہہ دیا گیا کہ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ (۶۶/۱) اے نبیؐ! جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے تو اسے حرام کس طرح کر سکتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر دولت جمع کرنا اور جائدادیں کھڑی کرنا اسلام کی رو سے حلال تھا (اور نبی اکرمؐ کے لئے اس باب میں خصوصی احکام کوئی نہ تھے) تو حضورؐ اسے اپنے اوپر حرام کس طرح قرار دے سکتے تھے؟ اس پابندی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ

مرض الموت کے ایام میں حضورؐ کے پاس سات دینار تھے اور حضورؐ فرماتے تھے کہ انہیں صدقہ کر دو لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہو گئی اور سب لوگ آپ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ آپ کو ہوش آیا تو

فرمایا وہ دینار لے آؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ محمدؐ کا اپنے رب پر کیا گمان ہوگا جب کہ وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ہوں۔ (پھر حضورؐ نے انہیں صدقہ کر دیا)۔ (متفق علیہ)

یعنی آپؐ خدا کے حضور اس شکل میں نہیں جانا چاہتے تھے کہ آپؐ کے گھر میں سات دینار بچے ہوں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس باب میں حضورؐ کس قدر محتاط اور متشدد تھے۔

(۱) یہ کوئی ہنگامی واقعہ نہیں تھا۔ حضورؐ نے شروع سے اخیر تک اپنی پوری زندگی اسی نہج سے گزاری تھی اس لئے یہ کسی صورت میں نہیں کہا جا سکتا کہ اسلامی تعلیم کا (معاذاللہ) یہ تقاضا نہیں تھا اسے آپ نے از خود اختیار کر رکھا تھا۔

(۲) اور سب سے بڑی بات یہ کہ اگر اسلامی تعلیم کچھ اور تھی اور آپؐ نے اپنے لئے خصوصی طور پر دوسرے نہج کی زندگی اختیار کر رکھی تھی تو مسلمانوں کے لئے اسلامی تعلیم کا اتباع ضروری ہوگا یا حضورؐ کے نہج زندگی کا اتباع؟

ان سوالات کے جواب میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کی زندگی مثالی زندگی (IDEAL LIFE) تھی جس تک پہنچنا ہر ایک کا کام نہیں ـــ لیکن ایسا کہتے وقت یہ حضرات اتنا نہیں سوچتے کہ اگر ایسی زندگی ایک رسول ہی بسر کر سکتا تھا اور رسول کے علاوہ کسی اور انسان کے لئے ایسی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی سیرت کو تمام مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار کیوں دیا۔ اسوہ (نمونہ) تو وہی ہو سکتا ہے جس کے مطابق بن جانا دوسروں کے لئے ممکن ہو۔ جس نہج زندگی کا اختیار کرنا عام طور پر ممکن نہ ہو، وہ نوعِ انسان کے لئے نمونہ بن ہی نہیں سکتا۔ ہم نے "نوعِ انسان" اس لئے لکھا ہے کہ قرآن میں ہے کہ حضورؐ "کافۃ للناس" کی طرف رسول ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ سوال جسے ہم نے اٹھایا ہے کس قدر اہم اور کتنے گہرے غور و فکر کا محتاج ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ اس کا اطمینان بخش حل کس قدر مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن یہ مشکل صرف اس لئے ہے کہ ایک طرف نبی اکرمؐ کی وہ نہج زندگی ہے جو بالکل صاف اور واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔ لیکن دوسری طرف وہ اسلام ہے جو ہمارے ہاں عام طور مروج چلا آ رہا ہے۔ حضورؐ کی وہ حیاتِ طیبہ اس اسلام کے نقشے میں فٹ نہیں بیٹھتی۔ اس لئے اس سے یہ تمام الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ہم اپنے ہاں کے مروجہ اسلام کی جگہ اس اسلام کو سامنے لے آئیں جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے تو حضورؐ کی یہ زندگی اس کی تعلیم کے عین مطابق ہو جاتی ہے اور اس ضمن میں نہ کوئی اشکال باقی رہتا ہے نہ الجھن پیدا ہوتی ہے۔

آپ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے آپ کو نظر آ جائے گا کہ انسانی معاشرہ کی ناہمواریوں اور فساد انگیزیوں کی ایک بین اور بنیادی وجہ بے حد و نہایت دولت اور ذاتی جائداد کا وجود ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک فرد جس قدر دولت سمیٹتا ہے وہ اسی حد تک دوسرے انسانوں کو اس سے محروم کر دیتا ہے۔ اگر یہ دولت چند انسانوں کے پاس جمع ہونی شروع ہو جائے تو اسی نسبت سے عوام اس سے محروم ہوتے جائیں گے۔ اس کا نتیجہ معاشرہ کی وہ ناہمواریاں ہیں جن سے

مختلف مفاسد وجود میں آتے ہیں۔ قرآن ان ناہمواریوں کو مٹا کر انسانی معاشرہ کو ان مفاسد سے پاک کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ دولت جمع کرنے کو روکے۔ آپ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس باب میں کس قدر واضح احکام اور ہدایات دی ہیں۔ وہ کھلے کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ (۹/۳۴) ۔ جو لوگ سونا اور چاندی (دولت) جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ (یعنی انسانیت کی نشوونما و فلاح) کے لئے کھلا نہیں رکھتے (صرف نہیں کرتے)۔ اے رسول! تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے"

اور یہ ظاہر ہے کہ جب دولت جمع نہیں کی جائیگی تو جائدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔

ذاتی جائداد کے حق میں شروع ہی سے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس کے بغیر انسان کے لئے کوئی جذبۂ محرکہ ایسا نہیں رہتا۔ جس سے وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کمائے۔ آپ غور کیجئے کہ اس دلیل کی رُو سے، یہ لوگ انسان کو کس پست مقام پہ لے آتے ہیں ــــ بالکل حیوانی سطح پر جہاں مفادِ خویش سے بلند کوئی مقصدِ زندگی ہی نہیں ہوتا۔ حالانکہ خود یہ لوگ اپنے ہاں کے ان لوگوں کو جنہوں نے مفادِ خویش سے بلند ہو کر عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ کیا ہو مستحقِ ہزار ستائش سمجھتے ہیں، ان کے مجسمے کھڑے کرتے ہیں۔ ان کی یادگاریں مناتے ہیں۔ انہیں اپنا ہیرو قرار دیتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر انہیں یہ تسلیم ہے کہ انسان کے لئے مفادِ خویش سے بلند بھی ایسے جذبات محرکہ ہو سکتے ہیں جن کی رُو سے وہ جان مار کر محنت کرے اور اپنی محنت کے ماحصل کو دنیا، انسان کی منفعت کے لئے عام کر دے۔ قرآن کریم اسی قسم کی بلند اقدار انسانوں کے سامنے پیش کر کے ان پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ جو لوگ ان اقدار پر ایمان لاتے ہیں ــــ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انہیں اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیتے ہیں ــــ وہ ان کی اجتماعیت سے ایک نظام قائم کرتا ہے جس میں یہ تمام افراد

(۱) نہایت محنت سے کام کرتے ہیں اور اپنی محنت کے ماحصل کو اس نظام کی تحویل میں دے دیتے ہیں۔

(۲) یہ نظام ان تمام افراد اور ان کی اولاد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ضمانت دیتا ہے اور ایسے سامان فراہم کرتا ہے جن سے ان کی انسانی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو سکے۔

(۳) اس کے بعد جو کچھ بچتا ہے دیگر افرادِ انسانیہ کی منفعت کے لئے صرف کیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، دوسری اقوام میں جو کچھ ان کے چند برگزیدہ افراد کر سکے ہیں قرآنی نظام کا ہر فرد وہی کچھ کرتا ہے ــــ فرمایئے! اس میں کونسی بات ایسی ہے جو ناممکن العمل ہو ــــ یا جسے چند برگزیدہ افراد یا حضرات انبیاء کرامؑ ہی سرانجام دے سکیں۔ وہ دوسرے انسانوں کے بس کی بات نہ ہو؟

قرآن اس نظام کو بتدریج۔ آہستہ آہستہ وجود میں لاتا ہے۔ اس لئے ہم اس میں ایسے احکام دیکھتے ہیں جن کا تعلق اس کے مختلف مراحل سے الگ الگ ہے۔ وہ ابتدائی اسٹیج میں صدقہ و خیرات کے "تلقینی اور تاکیدی" احکام

دیتا ہے۔ ترکہ اور وراثت سے متعلق قوانین مقرر کرتا ہے۔ قرضہ اور تجارت کے سلسلے میں ضوابط کی صراحت کرتا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ "انفاق" کی اہمیت برابر واضح کرتا چلا جاتا ہے۔ اگلے مرحلہ میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس حد تک نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے کھلا رکھیں اور صرف کر دیں۔ جواب دیا جاتا ہے قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب۔ اور ایک مرحلہ اس سے بھی آگے آتا ہے جس میں ان افرادِ جماعت کی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)۔ یہ خود تنگی میں گزارہ کر لیتے ہیں لیکن دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔

یہ تھی قرآن کریم کی وہ تعلیم جس کی درخشندہ و تابندہ، زندہ و پائندہ مظہر خود نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ تھی۔ حضورؐ اپنے متبعین کو آہستہ آہستہ اس آخری منزل تک لاتے تھے لیکن ان کے امیرِ کارواں ہونے کی جہت سے اپنی زندگی کو آپ نے شروع ہی سے اس نصب العین کا عملی پیکر بنا لیا تھا۔ یہی وہ حضورؐ کی زندگی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے آپ کے متبعین (اور ان کے بعد تمام نوعِ انسان) کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا تھا۔ امام (آگے چلنے والے) کی زندگی ہونی ہی ایسی چاہیئے جو اس کے متبعین کے لئے نمونہ بن سکے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ غور فرمائیے کہ اسلام کی تعلیم اور حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں کوئی ایسا تخالف رہتا ہے جس کے لئے ہمیں وہ دلائل تراشنے پڑیں جن کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے۔ یعنی یہ کہ عام مسلمانوں کے لئے الگ احکام تھے اور حضورؐ کے لئے الگ۔ یا یہ کہ حضورؐ کی زندگی مثالی تھی جس تک کوئی غیر از نبی پہنچ ہی نہیں سکتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ، حقیقی اسلام کا آئینہ تھی اور ایک ایسا نمونہ جس کے مطابق ہر انسان اپنی زندگی ڈھال سکتا ہے بشرطیکہ وہ نظام قائم ہو جائے جو دین کا مقصود و مطلوب ہے۔ آپؐ کی زندگی ہمارے مروجہ اسلام کے نقشے میں اس لئے فٹ نہیں بیٹھتی کہ یہ اسلام خود ہمارا اپنا وضع کردہ ہے۔ وہ اسلام نہیں جسے نبی اکرمؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور جو آج قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ وہ حقیقی اسلام جس کی آئینہ دار حضورؐ کی زندگی تھی، اس مروجہ اسلام میں کس طرح تبدیل ہوا اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکے گا۔ ہم قرآن کریم کی اس آیت کو دیکھ چکے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ "دولت جمع کرنے والوں کو دردناک عذاب سے آگاہ کر دو"۔ اس سلسلہ میں ابوداؤد کی روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

مشکوٰۃ کی ایک حدیث

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹/۳۴) جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسول! تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے۔ تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل

کو حل کروں گا۔ پس عمرؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا
نبی اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض
کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کرے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ
جائیں ان کو مال مل جائے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر
کہا۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ میں تم کو ایک ایسی بہترین چیز کا پتہ نہ دوں جس کو انسان جمع کرکے خوش
ہو اور وہ چیز نیک بخت عورت ہے۔ اس کی طرف مرد دیکھے تو اس کا دل خوش ہو۔ اور جب مرد اس کو کوئی
حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے۔ اور جب وہ غائب ہو تو اس کے مال و اولاد کی حفاظت کرے۔

(ابوداؤد) (مشکوٰۃ جلد اول۔ اردو ترجمہ ص۳۰۹)

یہ روایت زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ وضع کردہ ہے۔ یہ کبھی تصور میں بھی آسکتا ہے کہ خدا کا ایک حکم ہو اور صحابہؓ پر وہ گراں گزرے؛ پھر ان میں سے (کوئی اور بھی نہیں) حضرت عمرؓ اس حکم کو بدلوانے کے لئے رسول اللہ کے پاس جائیں اور رسول اللہؐ، خدا کے اس حکم کو یوں بدل دیں کہ اگر تم ڈھائی فیصد سالانہ ادا کردو تو تمہیں اجازت ہے کہ سونے چاندی کے ڈھیر جمع کرتے رہو۔

یا حضورؐ، صحابہؓ کو تو یہ حکم دیتے (کہ دولت جمع کرتے رہو۔ اس میں سے صرف زکوٰۃ نکال دیا کرو۔) اور خود قرآن کی آیت پر ہی عمل پیرا رہتے ——— یعنی ایک پائی بھی جمع نہ کرتے؟ روایت کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ ہمارے دورِ ملوکیت کی وضع کردہ ہے۔ جب سرمایہ داری مسلمانوں میں عام ہو گئی تھی۔ ہمارا مروجہ اسلام اسی قسم کی روایات پر مشتمل ہے۔ اس اسلام اور حضورؐ کی زندگی میں باہمی تضاد کا ہونا لازمی ہے۔ جب یہ تضاد ہمارے سامنے آتا ہے تو بجائے اس کے کہ ہم یہ کہیں کہ ہمارے اس اسلام میں کوئی نقص ہے جو یہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے مطابق نہیں۔ ہم اس اسلام کو سچا اسلام قرار دے دیتے ہیں اور حضورؐ کی زندگی کے متعلق اس قسم کی بارد توجیہات پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں ——— بلکہ اکثر و بیشتر اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ ایک طرف اس مروجہ اسلام کا بھی پرچار کرتے رہتے ہیں اور دوسری طرف اپنے وعظ اور میلاد کی مجالس میں حضورؐ کی سیرت کو بھی پیش کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ سیرتِ نبویؐ کے تذکرہ سے مقصود یا تو گرمیٔ محفل ہوتا ہے یا حصولِ ثواب، اس لئے ہم اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ کبھی کھڑے ہو کر سوچیں کہ جس اسلام پر ہم کاربند ہیں اس میں اور حضورؐ کی سیرت میں تضاد کیوں ہے؟ اس کی ضرورت اس صورت میں پڑتی اگر ہم نے حضورؐ کی سیرت کو اپنے لئے واقعی اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار دیا ہوتا۔ اب ذرا ان واعظوں اور لیکچراروں کی زندگی پر غور کیجئے جنہوں نے مہینہ بھر، صبح و شام ہمیں یہ بتایا تھا کہ حضورؐ کی زندگی ایسی تھی کہ آپؐ نے نہ ایک پیسہ جمع کیا نہ کوئی جائداد کھڑی کی اور نہ ہی کچھ ترکہ چھوڑا۔ اور پھر دیکھئے کہ کیا ان کی اپنی زندگی میں حضورؐ کے اس اسوۂ حسنہ کی کوئی جھلک نظر آتی ہے۔

جب آپ ان سے یہ سوال کریں گے کہ آپ نے اس قدر دولت کیوں جمع کر رکھی ہے اور اتنی بڑی جائدادیں کیوں کھڑی کر رکھی ہیں، تو وہ نہایت دھڑلے سے کہہ دیں گے کہ شریعتِ حقّہ اس کی پوری پوری اجازت دیتی ہے۔ دولت جمع کرنا خلافِ اسلام نہیں۔ آپ غور کیجئے کہ یہ کیسا کھلا ہوا تضاد ہے جسے ہم اس طرح بے محابا دنیا کے سامنے پیش کرتے چلے آتے ہیں اور کتنا بڑا فریب ہے جس میں ہم اپنے آپ کو مبتلا رکھے ہوئے ہیں۔ اگر حضورؐ کا اسوۂ حسنہ دنیا کے لئے بہترین نمونہ ہے تو اس کی رُو سے دولت جمع کرنے اور جائدادیں بنانے کی گنجائش کہاں ہے؟ اور اگر دولت جمع کرنا اور جائدادیں بنانا عین مطابقِ اسلام ہے تو پھر اس کے خلاف نہج زندگی کو ہم دنیا کے سامنے بطور نمونہ کیسے پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم ہیں کہ یہ بھی کرتے ہیں اور وہ بھی۔ ہم دنیا کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ بہترین دین ہے اور اس میں دولت جمع کرنے اور جائدادیں بنانے کی کھلی چھٹی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم دنیا سے یہ بھی کہتے ہیں کہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ انسانیت کے لئے بہترین نمونہ ہے اور اس بہترین نمونہ میں نہ دولت جمع کرنے کی کہیں گنجائش ہے اور نہ جائدادیں کھڑی کرنے کی۔ ہم یہ دونوں متضاد باتیں بیک زبان کہتے چلے جاتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ دنیا اس کے متعلق کیا کہتی ہے اور ہم اسے کس نہج زندگی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

یاد رکھئے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ دنیا میں معاشرتی مفاسد کی ایک بنیادی وجہ ذاتی جائداد کا وجود ہے۔ مفاد پرست طبقہ نے اس کے جواز میں عجیب عجیب دلائل وضع کر رکھے ہیں اور صدیوں کے پروپیگنڈہ سے عوام کے ذہن میں یہ باطل مفروضہ جاگزیں کر رکھا ہے کہ یہ چیز عین مطابقِ فطرت ہے۔ اس کے بغیر معاشرتی زندگی کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ نظامِ سرمایہ داری کی ساری عمارت اسی مفروضہ پر قائم ہے۔ (حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت کے علاوہ) اس غلط مفروضہ کے خلاف وقتاً فوقتاً کوششیں ہوتی رہیں۔ ان کوششوں کی آخری کڑی کمیونزم کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی کوشش بھی اس باب میں کامیاب نہ ہو سکی۔ (نہ ہی کمیونزم کامیاب ہوئی ہے۔ اس لئے کہ انہیں کوئی ایسا جذبہ محرکہ نہیں مل سکا جس کی رُو سے ایک فرد جان مار کر محنت کرے اور اپنی محنت کے ماحصل کو بطیبِ خاطر نوعِ انسان کی عالمگیر نشو ونما کے لئے وقف کر دے) قرآن کریم اس باطل معاشرتی نظام کے خلاف آسمانی احتجاج و انقلاب کی دعوت لے کر آیا اور نبی اکرمؐ نے اس انقلاب کو عملاً متشکل کر کے دکھا دیا کہ ایسا معاشرہ کس طرح ممکن العمل ہے۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ اسی نظام کی عملی تفسیر ہے۔ بعد میں ہمارے ہاں بھی وہی باطل نظام رفتہ رفتہ عود کر آیا۔ اسے اپنی کامیابی کے لئے یہ ضروری نظر آیا کہ ہمارے اولیں دور کی تاریخ کو (جب صحیح آسمانی انقلاب عمل میں آیا تھا) مسخ کر دے۔ ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں تھا اس لئے کہ ہماری تاریخ مرتب ہی اس دور میں ہوئی تھی جب مسلمانوں کی گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تھی۔ چنانچہ اس تاریخ کی رُو سے یہ دکھایا گیا کہ خود صحابہؓ کے زمانہ میں (معاذ اللہ) کتنے بڑے بڑے سرمایہ دار موجود تھے۔ لیکن غنیمت ہے کہ یہ تاریخ نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے اس گوشے کو مسخ نہ کر سکی۔ اس کی شاید ضرورت بھی نہ سمجھی گئی، کیونکہ

حضورؐ کے متعلق یہ عقیدہ عام کر دیا گیا کہ آپؐ کی زندگی ایک رسول کی زندگی تھی جس کی نظیر اور مثال نہیں مل سکتی۔ اس لئے دوسرے مسلمانوں کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ حضورؐ کی زندگی کی تقلید کر سکیں۔ اس طرح وہ نیا اسلام وجود میں آگیا جس کی رو سے دولت کے حدود فراموش انبار جمع کرنا اور آسمان بوس ذاتی جائدادیں کھڑی کرنا عین مطابق شریعت حقّہ قرار پا گیا یہی اسلام ہمارے ہاں اس وقت تک مروج چلا آرہا ہے۔ اس اسلام کی صداقت کو اس طرح ذہنوں میں راسخ کر دیا گیا ہے کہ آج اگر کوئی شخص یہ کہے کہ صحیح اسلام کی تصویر وہ ہے جو نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ میں جگمگاتی نظر آرہی ہے تو اس کے متعلق مشہور کر دیا جاتا ہے کہ وہ "کمیونسٹ" ہے اور ایسا کہنے والے کبھی اتنا نہیں سوچتے کہ ان کے اس اعتراض کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے؟ یعنی خود نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر۔

لیکن ان حربوں سے آسمانی انقلاب کی رو رُک نہیں سکتی۔ وہ انقلاب آکر رہے گا۔ خدا کے عطا فرمودہ ابدی حقائق قرآن کریم کی دفتین میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہیں اور ان کی عملی تفسیر حضور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ میں جھلمل جھلمل کر رہی ہے ۔۔۔ وہ زندگی جو ہمیں پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ انسان کو صحیح امن و اطمینان کی زندگی صرف اس معاشرہ میں نصیب ہو سکے گی جس میں نہ کسی فرد کو کچھ جمع کرنے کی ضرورت ہوگی نہ جائدادیں کھڑی کرنے کی حاجت۔ اس میں ہر فرد پوری پوری محنت کرے گا اور اپنی محنت کے ماحصل کو اپنے دل کی پوری رضامندی سے نوعِ انسان کی عالمگیر نشوونما کے لئے عام کر دے گا۔ نوعِ انسان اس وقت جس جہنم میں جھلس رہی ہے اس سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ اس ذاتِ گرامی کی سیرت طیبہ کو بطور نمونہ اپنے سامنے رکھے جسے رسول کافۃ للناس بنا کر بھیجا گیا تھا۔ جب دنیا نے حضورؐ کی زندگی کو اپنے لئے "اسوۂ حسنہ" قرار دے لیا تو اس وقت اس کی سمجھ میں یہ بات بھی آجائے گی کہ حضورؐ کس طرح "رحمۃ للعالمین" ہیں ۔۔۔ یعنی تمام نوعِ انسان کے لئے نشوونما کا موجب۔ اس سے انسان کو صحیح جنت کی زندگی میسر آئے گی ۔۔۔ اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد بھی ۔۔۔ ذرا غور کیجئے۔ "ہبوطِ آدم" (یعنی انسان کے پست سطح پر گر جانے) سے پہلے کی زندگی کو قرآن نے جنت کی زندگی سے تعبیر کیا ہے جس کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ "وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا" (۲/۳۵) جہاں سے کسی کا جی چاہے بافراغت کھائے پئے۔ اس میں کسی کی ذاتی ملکیت کا کوئی سوال ہی نہ تھا اور اس کے بعد کی زندگی میں جس جنت کا ذکر ہے اس میں بھی سامانِ زیست کی بے حد فراوانیاں ہیں۔ لیکن کسی کی ذاتی ملکیت کا کوئی ذکر نہیں کہ اس کی حدود کے اندر کوئی دوسرا قدم نہ رکھ سکے۔ وہاں کی کیفیت یہ ہوگی کہ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ (۳۹/۷۴) جہاں کسی کا جی چاہے رہے ۔۔۔ یعنی ایک ایسی اجتماعی زندگی جس کی خوش حالیوں اور کامرانیوں میں ہر فرد برابر کا شریک ہو اور کسی مقام پر بھی "ذاتی ملکیت" کی لکیریں کھنچی ہوئی نہ ہوں۔ اس جنت کی طرف جانے کا صرف ایک راستہ ہے اور یہ وہ راستہ ہے جس پر اس ذاتِ گرامی کی حیاتِ طیبہ کے نقوشِ قدم درخشندہ ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں جس نے ساری عمر ایک پیسہ جمع نہیں کیا اور

وفات کے وقت ایک دینار تک گھر میں رکھنا گوارا نہیں کیا۔

یا دیکھئے! رسول اللہ کی یہ زندگی ایک تارک الدنیا راہب، ایک خانقاہ نشین صوفی یا ایک بن باسی سنیاسی کی زندگی نہیں جو اپنی کمائی میں سے دوسروں کو دینا تو ایک طرف خود اپنی روٹی کے لئے بھی دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں۔ حضورؐ نے دُنیا حاصل کی اور بھرپور طور پر حاصل کی۔ آپؐ کی ساری زندگی مسلسل تگ و تاز اور پیہم سعی و عمل میں گزری جس سے ایک وسیع و عریض مملکت وجود میں آگئی۔ آپؐ اس مملکت کے اولین سربراہ اور مختارِ کل تھے لیکن یہ مملکت غریبوں اور محتاجوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے متشکل کی گئی تھی نہ کہ بڑے بڑے امراء و رؤسا پیدا کرنے کے لئے۔ یہ مملکت، خدا کے نظامِ ربوبیت کو قائم کرنے کا ذریعہ تھی جس کا نمونہ خود حضورؐ کی حیاتِ طیبہ تھی ــــ اور ہمارا ایمان ہے کہ اس نہج کی زندگی حضورؐ کے رفقاء کرام کی بھی تھی، اس لئے کہ ہو نہیں سکتا کہ خدا انہیں "مومن حقاً" کہے۔ انہیں والذین معہٗ کہہ کر پکارے، اور ان کی زندگی، حضورؐ کی زندگی سے مختلف ہو۔ ان سب کی زندگی ویسی ہی تھی۔ اس نظام میں ہر ایک کی زندگی کا نہج یہی ہونا چاہیئے تھا۔

نہ ہی حضورؐ کی یہ زندگی ایک کمیونسٹ کی زندگی تھی جس کی بنیاد نفرت اور انتقام پر ہوتی ہے اور جس کے سامنے، انسان کی حیوانی سطح سے بلند، زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کے سینے میں نفرت اور انتقام کی آگ بجھ جاتی ہے تو اس کے سامنے کوئی جذبہ محرکہ ایسا نہیں رہتا جو اسے اس نہج کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ کر سکے۔

یہ زندگی تھی ایک ایسے انسان کی جو اپنے پروگرام کو مستقل اقدارِ حیات کی مثبت بنیادوں پر استوار کرتا، اور جو دوسروں کی پرورش میں اپنی ذات کی نشوونما کا سامان پاتا ہے۔ اس کی زندگی، اسلام کی صحیح تفسیر ہوتی ہے جس میں دولت جمع کرنے اور جائدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نوعِ انسان کو بالآخر اس اسلام کی طرف آنا ہے۔ اس میں دیر اس لئے ہو رہی ہے کہ بدقسمتی سے خود مسلمان اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہے۔ اور اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ اسلام یہ نہیں تو اس سے پوچھئے کہ پھر حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے متعلق اس کا کیا خیال ہے؟ وہ اسلام کی صحیح تصویر تھی یا نہیں؟

حقائق و عبر

(۱) علمائے کرام کے فیصلے

سیاست اور دین میں فرق یہ ہے کہ سیاست کے فیصلے وقتی مصلحتوں کے تابع ہوتے ہیں اور مصلحتوں کے بدلنے کے ساتھ ساتھ سیاسی فیصلے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس دین کے فیصلے غیر متبدل اصولوں کے تابع ہوتے ہیں اور مصلحتوں کے بدلنے سے ان فیصلوں میں تبدیلی نہیں آسکتی۔

دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ علمائے کرام ہر معاملہ کا فیصلہ دین کے مطابق کرتے ہیں اور چونکہ اسلام میں سیاست، دین سے الگ نہیں اس لئے علمائے کرام سیاسی فیصلے بھی دین ہی کے علم کی روشنی میں کرتے ہیں۔ یہی وہ دلیل ہے جس کی رو سے کہا جاتا ہے کہ پاکستان کی سیاست چونکہ دین کے تابع رہنی ہے اس لئے یہاں زمامِ اقتدار علمائے کرام کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ آسیئے ذرا دیکھیں کہ ہمارے ان علمائے کرام کے فیصلے غیر متبدل رہتے ہیں یا مصلحتوں کے تابع بدلتے رہتے ہیں۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) تحریک پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ اسلام میں قومیت کا مدار دین ہے نہ کہ اشتراک وطن۔ لہٰذا ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں علمائے کرام پھیلے ہوئے تھے ان میں سے جہاں چند ایک نے اس نظریہ کی تائید کی، اکثریت نے اسے خلاف اسلام قرار دیا اور تحریک پاکستان کی سخت مخالفت کی۔ لیکن اب وہی اکثریت مملکتِ پاکستان کے زیر سایہ فاطمئنِ عیش کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اور مطمئن ہے کہ جداگانہ قومی نظریہ کے مطابق پاکستان کے وجود میں آنے سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑا۔ انہی میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو دو قومی نظریہ کے تو حامی تھے لیکن تحریک پاکستان کی مخالفت میں دوسروں سے بھی پیش پیش تھے اور ان کی دلیل یہ تھی کہ پاکستان میں ہندوستان سے بھی بدتر کافرانہ حکومت قائم ہوگی۔

(۲) ہندوستان کی جمعیت العلماء کا حال ہی میں ایک سالانہ اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا۔ ان علمائے کرام نے وہاں

کچھ تجاویز بھی پاس کی ہیں۔ ان میں سے ایک تجویز میں کہا گیا ہے "جمیعتہ العلمائے ہند پوری بصیرت کے ساتھ جمہوریت اور سیکولرازم کی سرگرم حامی ہے۔" انہی علمائے کرام کا جو گروہ پاکستان میں ہے ان کے نزدیک لادینی سیکولرازم کا ترجمہ ہی لادینی حکومت ہے۔ اور وہ جمہوریت جس میں ملک کا قانون غیر مسلم اکثریت کا مرتب کردہ ہو مسلمانوں کے لئے کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

جمیعتہ العلماء کی دوسری تجویز کشمیر کے متعلق ہے جسے ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے :۔

"جمیعتہ علماء ہند کا یہ اجلاس عام اس گفتگو کو جو کشمیر کے بارے میں بعض بیرونی طاقتوں کے ایما پر حال میں ہوئی ہے سخت ناپسند کرتا ہے اور جیسا کہ وہ بارہا اعلان کر چکا ہے کہ وطن عزیز کے کسی حصے پر بھی وہ کسی غیر ملکی اقتدار کو برداشت نہیں کر سکتا۔ فرقہ پرستوں کی اس تجویز کو قومی وقار کے لئے توہین آمیز اور شرمناک تصور کرتا ہے کہ کشمیر کے بعض حصوں کو حوالۂ پاکستان اس خوش فہمی پر کر دیا جائے کہ ہندوستان کا دفاع اس سے مضبوط ہو گا۔ اس طرح وہ اس بات کو بھی ناپسند کرتا ہے کہ کشمیر کے مسئلہ کو بعض لوگ اب بھی اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسا کہ تقسیم ہند سے پہلے دیکھتے تھے۔

جمیعتہ علمائے ہند کے نزدیک یہ مسئلہ خالص قومی اور ملکی مسئلہ ہے۔ اور اسی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ جمیعتہ علماء ہند جو ہمیشہ متحدہ ہندوستان کی حامی اور اس کی وحدت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کے لئے کوشاں رہی ہے۔

اسی بنا پر آج بھی اس کا نہایت شدت کے ساتھ اصرار ہے کہ کشمیر ہندوستان کا قدرتی جزو ہے اور اس پر ہندوستان کے سوا کسی ملک کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ لہٰذا جمیعتہ علماء ہند کا یہ اجلاس ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں اور حکومت سے پر زور اصرار کرتا ہے کہ کشمیر کی جنگ بندی لائن کو کسی بھی دباؤ یا مصلحت کی بنا پر تقسیم کی لائن تسلیم نہ کرے۔"

(ماہنامہ تذکرہ۔ دہلی جلد۔ ص ۳۰-۳۱)

ہم علمائے کرام سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جس دین کے علمبردار ہونے کے وہ مدعی ہیں کیا اس کی یہی کیفیت ہے کہ وہ پاکستان میں رہنے والے علماء کو جو باتیں یکسر کافر بناتا ہے ہندوستان میں بسنے والے علماء کو وہی باتیں عین مطابق اسلام بتاتا ہے؟ کیا یہی ہے دین کی وہ تعلیم جسے حاصل کرنے کے بعد وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دین و دنیا کے ہر معاملے میں فیصلہ کے لئے ان کی طرف رجوع کیا جائے۔

۲۔ قانونِ وصیت

اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ راجہ غضنفر علی مرحوم نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کی جائداد ان کی تین لے پالک لڑکیوں کو دی جائے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد یہ کہا گیا کہ چونکہ ان کی یہ وصیت "قانونِ شریعت" کے خلاف ہے اس لئے ان لڑکیوں کو جائداد سے ⅓ سے زیادہ کچھ نہیں مل سکتا۔ یعنی راجہ صاحب مرحوم کی جائداد

اور اس کی تقسیم سے کچھ تعلق نہیں لیکن ہم بتانا یہ چاہتے ہیں کہ جس چیز کو قانونِ شریعت " کہا گیا ہے اس کی حیثیت کیا ہے ؟ قرآن کریم نے انسانوں کی رہنمائی کے لئے بیشتر اصولی ہدایات دی ہیں لیکن بعض امور ایسے بھی ہیں جن کے لئے اس نے خود ہی قوانین متعین کر دئے ہیں۔ وصیت کا شمار انہی امور میں ہوتا ہے۔ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کریم کا قانون کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝

تم پر یہ فرض قرار دیا جاتا ہے کہ جب تم دیکھو کہ تمہاری موت قریب ہے اور تم اپنے پیچھے کچھ مال چھوڑ رہے ہو تو تم اپنے والدین اور دیگر اقربا کے لئے انصاف اور قاعدے کے مطابق وصیت کر جاؤ۔ ایسا کرنا تمام متقین پر خدا کی طرف سے ذمہ داری ہے۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے وصیت کرنے کی کس قدر سخت تاکید کی ہے۔ آیت کی ابتدا "کتب علیکم" سے ہوتی ہے یعنی تم پر فرض قرار دیا جاتا ہے۔ اور آخر میں کہا جاتا ہے "حقا علی المتقین" ایسا کرنا تمام متقین پر لازم ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ یہ وصیت والدین اور دیگر رشتہ داروں سب کے لئے ہوگی۔

وصیت کرنے کی تاکید

۲۔ سورۂ المائدہ میں وصیت کے سلسلے میں تفصیلی طور پر بتا دیا کہ اس کے لئے دو صاحب عدل گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ اور پھر اس کی بھی تاکید کر دی کہ گواہ سچی شہادت دیں۔ (دیکھئے ۵/۱۰۶) اس سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے وصیت کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔

مزید وضاحت

۳۔ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے مختلف وارثوں کے حصے مقرر کئے ہیں۔ ان حصوں کا حکم اس طرح ہے کہ

لڑکے کو اتنا ملے گا۔ لڑکی کو اتنا۔ باپ کو اتنا۔ ماں کو اتنا۔ مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِي بِهَآ أَوْ دَيْنٍ قرضہ کی ادائیگی کے بعد۔ اور اس وصیت کے بعد جو مرنے والے نے کی ہو۔

اس کے بعد پھر بعض وارثوں کے حصوں کا ذکر ہے یعنی

بیوی کو اتنا ملے گا۔ خاوند کو اتنا۔ مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ؕ قرضہ کی ادائیگی یا اس وصیت کے بعد جو تم نے کی ہو۔

اس کے بعد مزید احکام ہیں کہ

یہ شکل ہو تو اتنا اور یہ ہو تو اتنا۔ مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ؕ قرضہ کی ادائیگی یا اس وصیت کے بعد جو تم نے کی ہو۔

اس کے بعد پھر مزید احکام ہیں کہ

اگر مرد یا عورت کلالہ ہو تو اس کی وراثت یوں تقسیم ہو گی۔ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَاۗرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ (۴/۱۲) یا اس وصیت کے بعد جو کی گئی ہو یا قرضہ کی ادائیگی کے بعد جو کسی کو نقصان پہنچانے کی غرض سے نہ لیا گیا ہو۔ یہ اللہ کی طرف سے تاکیدی حکم ہے۔

ان آیات میں مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ کے معنی بالکل واضح ہیں۔ یعنی اگر وصیت کل مال کو محیط نہ ہو (cover نہ کرتی ہو) یا اگر کسی کو وصیت کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا ہو تو پھر اس کے ترکہ کی تقسیم اس طرح ہو گی۔ اگر اس کی وصیت کل مال کو محیط ہو گی تو پھر ان حصوں کے مطابق ترکہ کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔

اس کی مصلحت

ظاہر ہے کہ ہر شخص کے حالات مختلف ہوتے ہیں اور ان کی روشنی میں وہی ٹھیک فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کے مال میں سے کس کو کس قدر ملنا مناسب ہے۔ خدا نے انسانوں کا یہ اختیار سلب نہیں کیا بلکہ اسے فرض قرار دیا کہ ہر شخص اپنے اپنے حالات کے مطابق حق وانصاف کے ساتھ وصیت کر کے مرے۔ ہاں البتہ اگر ایسا ہو کہ ایک شخص کی موت اچانک واقع ہو گئی ہے اور اسے وصیت کرنے کا وقت نہیں ملا یا اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد بھی کچھ بچ رہتا ہے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اسے وارثین کی مرضی پر نہیں چھوڑ دیا کہ وہ جس طرح چاہیں ترکہ کی تقسیم کریں۔ اس طرح بے شمار جھگڑے پیدا ہو جاتے۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے مختلف وارثوں کے حصے خود مقرر کر دیئے۔

۴۔ آپ قرآن کریم کی ان آیات پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کیا ان میں کسی قسم کا کوئی الجھاؤ یا پیچیدگی ہے؟ (الجھاؤ یا پیچیدگی تو قرآن کے کسی حکم میں بھی نہیں) نیز اس پر بھی غور کیجئے کہ اس باب میں قرآن نے کس قدر وضاحت سے کام لیا ہے اور وصیت کے متعلق کس قدر تاکیدی احکام دیئے ہیں۔ جہاں وصیت کا حکم دیا ہے وہاں ایک بار نہیں بلکہ دو بار کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا کی طرف سے فرض قرار دیا گیا ہے اور جہاں ترکہ کے حصوں کا ذکر ہے وہاں دو آیتوں میں چار مرتبہ اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ وارثوں کے یہ حصے وصیت پوری ہونے کے بعد ہوں گے۔

ہمارا مروجہ قانون

لیکن ہمارے ارباب شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مال کے ۱/۳ حصے سے زیادہ کے لئے وصیت نہیں کر سکتا۔ اور یہ وصیت وارثوں کے لئے نہیں ہو سکتی۔ غور کیجئے۔ قرآن کریم نے بالفاظ صریح کہا ہے کہ اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (۲/۱۸۰) وصیت والدین اور دیگر رشتہ داروں کے لئے کرنی ہوگی۔ لیکن ان حضرات کا فیصلہ ہے کہ وصیت وارثوں (والدین یا دیگر رشتہ داروں) کے لئے نہیں ہو سکتی۔ پھر قرآن نے اس کل مال کیلئے وصیت کا حکم دیا ہے جسے کوئی شخص چھوڑ کر مرے (اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۔ ۲/۱۸۰) اس نے

ہمیں نہیں کہا کہ وصیت اتنے حصے تک ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ کے لئے نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان حضرات کا ارشاد ہے کہ نہیں! یہ وصیت صرف ایک تہائی مال میں ہو سکتی ہے۔ اسی کے مطابق ہمارا موجودہ قانون ہے۔ اس قانون کی رُو سے جس قدر مشکلات پیدا ہو رہی ہیں اس کی مثالیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص کے دو بیٹے ہیں اس نے اپنے بڑے بیٹے کو پڑھایا لکھایا۔ بیرسٹر بنایا وہ اب بڑا مرفہ الحال ہے دوسرا بیٹا حال ہی میں پیدا ہوا ہے۔ اس کی پرورش، تعلیم و تربیت سب کچھ باقی ہے اس کے ان حالات اور انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ اس نومولود بیٹے کے لئے ایسی وصیت کر جائے جس سے اس کی تعلیم و تربیت بھی ایسی ہو سکے جیسی اس نے اپنے بڑے بیٹے کی کی تھی لیکن مروجہ قانون کی رُو سے یہ شخص اپنے اس بیٹے کے لئے کوئی وصیت نہیں کر سکتا اس کے مرنے پر اس کی جائداد دونوں بیٹوں میں برابر تقسیم ہو جائے گی۔ یہ تو ہم نے صرف ایک مثال پیش کی ہے۔ اس قسم کے مختلف واقعات ہر روز سامنے آتے رہتے ہیں جن میں اس قانون کی بدولت سینکڑوں مستحق محتاج رہ جاتے ہیں اور جائداد ان کے پاس چلی جاتی ہے جنہیں مرنے والا حق و انصاف کے مطابق ایک پائی بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ محتاج بے چارے واویلا مچاتے ہیں لیکن ان کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ قانون کے سامنے کسی کی کیا چل سکتی ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ قانونِ شریعت ——— کہ وصیت ایک تہائی سے زیادہ کے متعلق نہیں کی جا سکتی اور وارثوں کے متعلق نہیں کی جا سکتی ——— رسول اللہؐ کی ایک حدیث پر مبنی ہے۔ ہم اس حدیث کا تجزیہ نہیں کرنا چاہتے لیکن ایک اصولی سوال پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ایک ایسی روایت جو قرآن کریم کے ایک واضح قانون کے اس طرح خلاف جاتی ہو اس کے متعلق کبھی باور بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ رسول اللہؐ کا ارشاد ہوگا؟ ہماری تو اس تصور سے روح کانپتی ہے کہ کسی ایسی بات کے متعلق جو قرآن کے صریحاً خلاف ہو، یہ کہا جائے کہ ایسا رسول اللہؐ نے فرمایا تھا۔ ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔ اگر ہمارے مجموعۂ روایات میں کوئی ایسی روایت پائی جاتی ہے جو قرآن کے خلاف ہے تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہیئے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں ہو سکتا۔ وہ روایت وضعی ہے لیکن آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ ہمارے اربابِ شریعت کا فتویٰ یہ ہے کہ ایسی صورت میں (جب کہ روایت قرآن کے کسی حکم کے خلاف جاتی ہو) روایت کو صحیح مانو اور قرآن کے حکم کو منسوخ سمجھو۔ چنانچہ "علامہ مولوی حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی" اپنے رسالہ "فتنۂ انکار حدیث" میں لکھتے ہیں:-

حدیث قرآن کی ناسخ ہے

نبی کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت ہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے۔ جس طرح کہ قرآن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہو تو حجت ہو اور ہماری عقل کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو ——— اسی طرح نبی کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت

ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو (ص۸۲)

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ قولِ رسولؐ قرآن کے خلاف ہو تو بھی وہ حجت ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ (یعنی) تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آجائے رسولؐ اللہ نے فرمایا لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ۔ وارث کے لئے وصیت نہیں اور تو امت تابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا۔ اور قولِ رسولؐ، قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔ (ص۸۵)

یعنی یہ حدیث قرآن کے خلاف ضرور ہے لیکن عمل اسی کے مطابق ہوگا کیونکہ اس نے قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ یہ عقیدہ تنہا حافظ ایوب صاحب کا نہیں، ہمارے تمام علمائے کرام کا یہی فتویٰ ہے اور انہی کے فتوے کے مطابق اس قانون کو قانونِ شریعت کہا جاتا ہے، جو قرآن کے حکم کے صریحًا خلاف جاتا ہے اب آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ کسی ایسے فیصلے کو جو قرآن کریم کے اس طرح خلاف جاتا ہو، قانونِ شریعت کہنا کتنی بڑی جسارت ہے۔ لیکن آپ ذرا اس سوال کو اٹھایئے کہ اس خلافِ قرآن قانونِ وصیت کو منسوخ کر کے اس کی جگہ قرآنی قانون کو نافذ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہمارے حضرات علمائے کرام کی طرف سے کس قدر طوفان برپا کیا جاتا ہے۔

مُفت

دوا۔ برائے دمہ، دردِ گردہ، و پتھری

ملنے کا پتہ

حاجی محمد دین۔ شیخ آئس فیکٹری متصل گنبش کھو پلاٹ

لارنس روڈ ——— کراچی

اپنے پتہ کا لفافہ بھیج کر دوا مفت منگائیں

باسمہ تعالیٰ

انسان کے بنیادی حقوق

اصل تہذیب احترام آدمی است

پرویز صاحب کی تقریر

جس سے انہوں نے طلوع اسلام کنونشن

۱۹۶۳ء سے

خطاب کیا

شائع کردہ
ادارہ طلوع اسلام
۲۵ بی، گلبرگ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنیادی حقوقِ انسانیت

اور

قرآن

علمائے حیاتیات اور علم النفس، اس پر متفق ہیں کہ تحفظِ خویش (Self Preservation) کا جذبہ ہر ذی حیات میں، جبلی طور پر پایا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جبلی جذبات میں اسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسی جذبہ کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی ہر متاعِ عزیز کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ جب انسانوں نے مل جل کر، تمدنی زندگی بسر کرنی شروع کی، تو ان کے مفاد میں تصادم ہونے لگا۔ اس سے افراد نے محسوس کیا کہ، انفرادی زندگی بسر کرنے سے ان کی وہ چیزیں محفوظ نہیں رہ سکتیں جنہیں وہ اپنی متاعِ عزیز اور سرمایۂ گراں بہا سمجھتے ہیں۔ اس کے لئے

حکومت کی بنیاد

انہوں نے اجتماعی نظم و نسق کا تصور وضع کیا، جسے اب حکومت کہا جاتا ہے۔ اس نظمِ اجتماعی کا مقصد اولین یہ تھا کہ افراد کی وہ چیزیں محفوظ رہیں جنہیں وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔

حکومت کی بنیاد تو اس مقصد کے ماتحت رکھی گئی تھی لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ تلخ حقیقت سامنے آگئی کہ حکمران طبقہ کے ہاتھوں لوگوں کا کوئی حق بھی محفوظ نہیں رہا۔ اس طبقہ نے تقسیم یوں کی کہ حقوق سب کے سب، اربابِ حکومت کے ہیں اور ذمہ داریاں تمام کی تمام رعایا کی۔ لوگ اس تقسیم کو گوارا نہ کرتے لیکن مذہبی پیشوائیت

حقوق طبقہ حکمران کے

آگے بڑھی اور یہ کہہ کر عوام کو اس تقسیم کے سامنے جھکا دیا کہ راجہ ایشور کا اوتار ہوتا ہے۔ بادشاہ خدائی حقوق (DIVINE RIGHTS) کا حامل

ہوتا ہے۔ سلطان زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے، اس لئے فرماں روائی اس کا حق اور اطاعت گزاری تمہارا فریضہ ہے۔ وہ جو کچھ تمہیں دے، اس کی عنایت اور احسان ہے۔ تم اس سے بطور حق کچھ نہیں مانگ سکتے۔ تم اس کے حضور جھکو۔ اُسے سجدے کرو۔ اس کی خیریت کی دعائیں مانگو۔ اس کے ہر حکم کی اطاعت کرو، اور اس اطاعت کو اپنے لئے سرمایۂ ہزار سعادت سمجھو۔ تم اور جو کچھ تمہارا ہے، وہ اس سب کا مالک ہے۔ اُسے ان تمام چیزوں پر کلّی اختیار حاصل ہے۔ وہ تمہارا اَن داتا (رازق) اور پالن ہار (پروردگار) ہے۔ تم اس سے خیرات مانگ سکتے ہو۔ کوئی شے بطور حق کے طلب نہیں کر سکتے۔

حاکم اور محکوم کے باہمی تعلق کا یہ تصور اسی طرح چلا آرہا تھا کہ سترھویں صدی عیسوی میں، یورپ کے سیاسی نظریات میں ایک انقلاب آیا جس کی رو سے، اس تعلق کو از سرِ نو متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ کہا یہ گیا کہ ان دونوں (فریقوں) کا تعلق، ایک معاہدہ کی رو سے متعین ہونا چاہیئے۔ اسے نظریۂ میثاق (Contract Theo-ry) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ

(۱) تمدنی زندگی بسر کرنے سے پہلے انسان فطری حالت پر تھا۔

(۲) اُس فطری حالت میں انسان کچھ حقوق رکھتا تھا جنہیں ہنوز کسی نے غصب نہیں کیا تھا۔

(۳) جب انسان کو اپنے فطری حقوق کے تحفظ کے متعلق خطرہ لاحق ہوا تو اس نے معاشرتی زندگی اختیار کی۔ لہٰذا، معاشرہ (سوسائٹی) کا وجود، انسان کے فطری حقوق کے تحفظ کے جذبہ کا رہینِ منت ہے۔

مغربی مفکّرین کے نظریات

(۴) بنابریں، معاشرہ کا فریضہ ہے کہ انسان کے فطری حقوق کا تحفظ کرے۔

(۵) ان فطری حقوق کا نام ہے "بنیادی حقوق انسانیت"۔

اس نظریہ کا اولیں داعی، یورپ کا مشہور مفکر ہابز (Hobbes-1588-1679) تھا۔ وہ کہتا ہے کہ "اپنے حکم کو دوسروں سے منوانا، انسان کی فطرت میں داخل ہے" لیکن اس کے ساتھ ہی "قیامِ امن" بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں یک جا نہیں رہ سکتیں۔ جب ہر فرد، اپنا حکم دوسروں سے منوانے پر تُل جائے تو امن کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ لہٰذا، انسان کو، اس دوسرے مقصد کے حصول کے لئے، اپنے پہلے حق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ بنابریں، ہابز کے نزدیک، قیامِ امن انسان کا واحد بنیادی حق ہے جس کے لئے وہ اپنے ہر دیگر حقوق سے دستکش ہو جاتا ہے۔

نظریۂ میثاق کا دوسرا علمبردار لاک (LOCKE-1632-1704) ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے بنیادی حقوق "زندگی۔ صحت۔ آزادی۔ اور املاک" ہیں۔ ان کے تحفظ کے لئے انسان صرف اپنا ایک حق چھوڑتا

ہے' اور وہ ہے' متنازعہ فیہ معاملات میں خود فیصلہ کرنے کا حق۔ لاک کہتا ہے کہ افراد کو چاہیئے کہ اپنے اس حق کو معاشرہ کے سپرد کریں' اور اس کے بعد معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ افراد کے دیگر حقوق کا تحفظ کرے۔

چونکہ ہابز اور لاک کے ہاں' بنیادی حقوق کا تصور' ان کے نظریۂ میثاق کی ایک ذیلی شق کے طور پر آتا ہے' اس لئے یہ کچھ ایسا واضح اور متعین نہیں۔ اسے' ایک جداگانہ اور مستقل نظریہ کی حیثیت سے TOM-PAINE- (1737- 1809) نے پیش کیا جس کی کتاب (RIGHTS OF MAN) آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ اس نے' "زندگی- آزادی- املاک. حفاظت اور استبداد کی روک تھام" کو بنیادی حقوقِ انسانیت قرار دیا ہے۔ یہی تھے وہ حقوق' جنہیں' انقلاب فرانس کے بعد' فرانس کی نیشنل اسمبلی نے اپنے چارٹر میں درج کیا تھا۔ امریکہ کا منشورِ آزادی (۱۷۷۶ء) بھی' پین ہی کے فطری حقوق کے نظریہ پر مبنی تھا۔ اس میں زندگی اور آزادی کے ساتھ "حصولِ مسرت" کو بھی بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں روس کی کانگریس نے مزدوروں اور کسانوں کے سلسلہ میں بنیادی حقوق کا ایک منشور مرتب کیا جس میں کہا گیا کہ "اس منشور سے مقصود یہ ہے کہ ایک انسان' کسی دوسرے انسان کو لوٹ نہ سکے۔ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے اور تمام ممالکِ عالم میں معاشرہ کی تشکیل اشتراکی خطوط پر کی جائے۔"

مجلس اقوامِ متحدہ

کچھ عرصہ ہوا' مجلس اقوامِ متحدہ (U.N.O) نے' (HUMAN RIGHTS COMMISSION) کے نام سے ایک تحقیقاتی بورڈ قائم کیا تھا کہ وہ کامل غور و خوض کے بعد' سفارشات کرے کہ انسانیت کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔ ان سفارشات کو' تمام اقوامِ عالم کی نمائندہ جماعت (U-N.O) نے خود جانچا اور پرکھا' اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں وہ چارٹر شائع کیا جسے "منشورِ حقوقِ انسانیت" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی اس کوشش کو' اس وقت تک' اس باب میں حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔ جو حقوق اس چارٹر میں درج ہیں۔ وہ مختصر الفاظ میں حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور بنیادی حقوق کے یکساں حقدار ہیں۔

(۲) زندگی- آزادی- اور حفاظتِ جان کا حق۔

(۳) غلامی کی ممانعت۔

(۴) بے رحمی کے سلوک سے حفاظت کا حق۔

(۵) قانون کے معاملہ میں یکساں سلوک کا حق۔

(۶) کسی شخص کو بلا قصور گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ نہ نظر بند یا جلا وطن کیا جائے گا۔

(۷) جب تک الزام ثابت نہ ہو' ملزم کو بے قصور تصور کئے جانے کا حق۔

(۸) مسائل زندگی اور خط و کتابت میں عدم مداخلت کا حق۔
(۹) نقل و حرکت کی آزادی۔
(۱۰) ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا بسنے کی آزادی۔
(۱۱) حق قومیت۔
(۱۲) شادی کا حق۔
(۱۳) حقوق جائیداد۔
(۱۴) خیالات۔ ضمیر اور مذہب کی آزادی۔ نیز اظہار خیالات اور اجتماعات میں شرکت کی آزادی۔
(۱۵) اپنے ملک کی حکومت میں شرکت کا حق۔
(۱۶) تعمیر خویش کے لئے وسائل و ذرائع کی آزادی۔
(۱۷) حسب منشاء کام کاج کی آزادی۔
(۱۸) آرام اور فرصت کی آزادی۔ نیز معیار زندگی اور تعلیم کا حق۔
(۱۹) جماعتی اور ثقافتی زندگی میں شرکت کا حق۔

یہ ہے مختصراً ان حقوق کی فہرست جسے اقوام عالم کے نمائندگان نے اپنے مسلمہ چارٹر میں داخل کر رکھا ہے۔ ان حقوق سے کن شرائط کے ماتحت بہرہ یاب ہوا جا سکتا ہے اس کے متعلق ذرا آگے چل کر ذکر کیا جائے گا۔ سردست اتنا اضافہ کافی ہو گا کہ اس فہرست کے بعد چارٹر میں یہ تحریر ہے کہ ان حقوق اور اختیارات کو ان حدود کے تابع استعمال کیا جا سکتا ہے جو، مختلف ممالک میں از روئے قانون عائد کی جائیں ——— چونکہ اپنی اپنی مرضی کے مطابق قوانین سازی کا حق ہر ملک کو حاصل ہے، اس لئے ان قوانین کے تابع، "بنیادی حقوق انسانیت" کی جو حیثیت رہ جاتی ہے، وہ ظاہر ہے ———

یہ ہے، برادرانِ عزیز! اجمالی سا تذکرہ ان کوششوں کا جو ان کے بنیادی حقوق متعین اور تسلیم کرنے کے سلسلہ میں، انسانی فکر نے آج تک کی ہیں۔ اب، ان کے مقابلہ میں، اس ضابطہ حقوق کو سامنے لائیے

قرآن کا اعلان

جو چھٹی صدی عیسوی میں ——— جب دنیا انسان کے بنیادی حقوق کے تصور تک سے ناآشنا تھی ——— تمام نوع انسان کی راہ نمائی کے لئے، خدا کی طرف سے دیا گیا اور جس پر عمل کر کے اس ضابطہ آسمانی کے لانے والے، پیغمبر آخرالزمان نے، دنیا کو پہلی بار اس حقیقت کبریٰ سے روشناس کرایا کہ دنیا میں انسان کا مقام کیا ہے اور اس کے وہ حقوق کیا ہیں جنہیں دنیا کی کوئی طاقت چھین نہیں سکتی۔ اُن حقوق کا تفصیلی تذکرہ، اس مختصر سے وقت میں مشکل ہے، اس لئے میں

اُن کے اجمالی تعارف پر ہی اکتفا کروں گا۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

قرآنی نظریہ میثاق

سب سے پہلے اس بات کو دیکھئے کہ نظریۂ میثاق، جسے عصرِ حاضر کی سیاسی فکر کا معرکہ آرا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے، اس کا تصور بھی قرآن کریم ہی نے پیش کیا تھا۔ لیکن وہ اس میثاق کو حاکم اور محکوم میں استوار نہیں کرتا ——— اس کے نزدیک انسانوں میں حاکم اور محکوم کا تصور ہی باطل ہے۔ میں جیسا کہ ذرا آگے چل کر بیان کروں گا، اس کی رُو سے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ وہ اس میثاق کو خدا اور بندوں کے درمیان معاہدہ قرار دیتا ہے۔ لیکن چونکہ اس میثاق کے لئے خدا خود بندوں کے سامنے نہیں آتا، اس لئے یہ میثاق افراد اور اُس معاشرہ کے درمیان طے پاتا ہے جو نظامِ خداوندی کو متشکل کرنے کے لئے وجود میں آتا ہے۔ میثاق کے الفاظ یہ ہیں کہ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹:۱۱۱)

افرادِ معاشرہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اگر دنیا میں نظامِ عدل و احسان کے قیام اور استحکام کی خاطر ضرورت پڑے تو ان کا مال اور ان کی جان، اس مقصد کے لئے، نظامِ خداوندی کے سپرد ہوں گے۔ اور نظامِ خداوندی (یا معاشرہ) ان سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں، اس کے عوض "الجنۃ" عطا کرے گا۔ اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی اور اُخروی زندگی میں بھی جنت۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے الجنۃ میں وہ تمام خوش حالیاں اور خوش گواریاں، سرفرازیاں اور سربلندیاں۔ اطمینان اور سکون۔ امن اور سلامتی۔ غرضیکہ وہ سب کچھ آجاتا ہے جس کی انسان آرزو کرسکتا ہے۔ اس میثاق کی رُو سے، ان تمام چیزوں کا حصول، ان لوگوں کا بنیادی حق ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے جنتی معاشرہ کی جو تفاصیل بیان کی ہیں، اگر میں ان کا ذکر کروں تو اس سے ایک ایسی جامع فہرست مرتب ہو جائے گی جسے ان افرادِ معاشرہ کے بنیادی حقوق کا چارٹر سمجھا جائے گا۔ لیکن میں اس وقت، اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اس لئے کہ یہ حقوق اُن لوگوں کے ہوں گے جو اُس میثاقِ خداوندی کا ایک فریق ہوں گے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اور میرا موضوع، اُن حقوق سے متعلق ہے جو قرآن کی رُو سے دنیا کے ہر انسان کو، محض انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔

قرآنی حقوقِ انسانیت

یہ حقوق، کسی معاہدہ یا میثاق سے مشروط نہیں ہوں گے۔ نہ کسی خدمت کا معاوضہ۔ یہ بلا مشروط ہوں گے اور بلا مزد و معاوضہ ہر انسان کو ——— بلاتخصیص مذہب، ملت، زبان، رنگ، نسل، وطن، محض انسان ہونے کی

جہت سے حاصل ہوں گے۔ دیکھئے یہ حقوق کیا ہیں، جنہیں ہر انسان قرآنی معاشرہ سے، ہر وقت طلب کر سکتا ہے۔

(۱) احترامِ آدمیت

پہلا حق یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، پیدائش کے اعتبار سے یکساں طور پر عزت کا مستحق ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) قرآن کا ارشاد ہے۔ یعنی "ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔" اگر حسب و نسب کے اعتبار سے کسی انسان کو بہ نظرِ حقارت دیکھا جائے اور دوسرے کو زیادہ واجب العزت سمجھا جائے۔ یا خاندانی نسبت کی بنا پر کسی سے، کسی قسم کی رعایت کی جائے، تو یہ تفریق و تخصیص جس انسان کے خلاف جائے اُسے حق حاصل ہوگا کہ وہ اس کا مداوا طلب کرے، اور قرآنی معاشرہ کا فریضہ ہوگا کہ وہ اس کے نقصان کی تلافی کرے۔ "آدمیت احترامِ آدمی" قرآن کا پہلا اصول، اور ہر انسان کا اولین بنیادی حق ہے۔

(۲) جنسی مساوات

قرآن کی رُو سے، جنسی تفریق نہ وجہِ ذلت ہے نہ باعثِ امتیاز۔ یعنی، نہ مرد، محض مرد ہونے کی حیثیت سے عورتوں سے افضل ہیں، اور نہ ہی عورتیں، محض عورت ہونے کی بنا پر مردوں سے کہتر۔ زندگی کی ابتدا نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے (خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ - ۴/۱) قرآن کا ارشاد ہے۔ ہر انسان بچہ میں — خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ کچھ حصہ مرد کا ہوتا ہے اور کچھ حصہ عورت کا — اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى (۴۹/۱۳)۔ اس لئے نہ مرد، عورتوں سے الگ کوئی نوع ہیں، نہ عورتیں، مردوں سے الگ کوئی جنس۔ دونوں نوعِ انسان کے افراد ہیں، اور جس مقام کا مستحق ایک انسان ہے، اس میں مرد اور عورت، دونوں یکساں طور پر شریک ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے دروازے ایک صنف کے لئے کھلے رکھے جائیں، اور دوسری پر بند کر دیئے جائیں۔ حیاتیاتی طور پر (BIOLOGICALLY) مرد اور عورت کی ساخت میں جو فرق ہے اس کا تعلق ان کے طبیعی وظائفِ حیات سے ہے۔ انسانیت کی سطح پر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں عمل کا میدان دونوں کے لئے یکساں ہے، اور اعمال کے نتائج بھی یکساں۔ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ (۳/۱۹۴)۔ تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کا اجر ضائع نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت — مرد اور عورت کی تخصیص کے معنی کیا؟ تم ایک دوسرے کے اجزا ہو۔ تم خلقت اور سیرت کے اعتبار سے ایک ہو — زندگی کے تمام معاملات میں یکساں طور پر شریک رہتے ہو۔ تم ایک نوع کے فرد ہو۔ پھر اعمال کے نتائج میں فرق کس طرح ہو سکتا ہے؟

لہٰذا، جنسی مساوات، انسانیت کا بنیادی حق ہے جسے کسی صورت میں بھی غصب نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنی معاشرہ اس حق کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔

(۳) مدارج علیٰ قدرِ اعمال

احترامِ آدمیت کے بعد، معاشرہ میں مختلف افراد کے مدارج کا سوال سامنے آتا ہے اس کے لئے اصول یہ ہے کہ وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا (۴۶/۱۹)۔ ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ، اس کے اعمال و کردار کے مطابق متعین کیا جائے گا۔ یعنی سب سے پہلے ہر انسان کی عزت بحیثیت انسان ہو گی، اور اس کے بعد اس کے جوہرِ ذاتی اور حسنِ سیرت و کردار کو دیکھا جائے گا، اور ان کے مطابق سوسائٹی میں ہر ایک کا مقام اور درجہ مقرر کیا جائے گا۔ جو جتنی زیادہ خوبیوں کا مالک، وہ اتنے ہی اونچے مقام کا مستحق۔ حتیٰ کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۴۹/۱۳) جو سب سے زیادہ حسنِ عمل کا پیکر، وہ سب سے زیادہ واجب العزت۔ نیچے سے لے کر اوپر تک، عزت کا ہر مقام ہر شخص کے لئے کھلا ہو گا، جسے وہ، اپنی قابلیت اور حسنِ سیرت کی رُو سے بطور حق حاصل کر سکے گا۔ اس کا یہ حق اس سے کوئی نہیں چھین سکتا، نہ ہی تعینِ مدارج کا کوئی اور معیار مقرر کیا جا سکتا ہے۔

(۴) حقِ آزادی

"آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔" یہ نعرہ اور اعلان تو آپ نے ہر جگہ سے بلند ہوتا سنا ہو گا لیکن اس کا صحیح مفہوم بہت کم سامنے آیا ہو گا۔ جس جگہ سے آپ نے یہ نعرہ بلند ہوتے دیکھا ہو گا، وہیں سے آپ نے آئے دن ایسے احکام نافذ ہوتے بھی دیکھے ہوں گے جو ہر شخص کی آزادی پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرتے چلے جائیں۔ لہٰذا یہ بات کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ اگر آزادی، انسان کا پیدائشی حق ہے، تو پھر اس پر یہ پابندیاں کیوں عائد کی جاتی ہیں۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ پابندیاں قانون کی رُو سے عائد کی جاتی ہیں۔ اور قانون کی رُو سے عائد کردہ پابندیاں، انسانی آزادی کو سلب نہیں کرتیں، اس لئے کہ اگر پابندیاں عائد نہ کی جائیں تو کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے۔ لہٰذا صحیح آزادی کے لئے قانونی پابندیاں لاینفک ہیں۔ یہ درست ہے کہ معاشرہ کے قیام اور افراد کی حفاظت کے لئے قانونی پابندیاں ضروری ہیں، لیکن یہ بھی تو ظاہر ہے کہ اربابِ اقتدار جنہیں قانون سازی کا اختیار حاصل ہوتا ہے، جس قدر ظلم اور زیادتی، قانون کے پردے میں کر سکتے ہیں، لاقانونیت کا استبداد اس کے سامنے ہیچ ہوتا ہے۔ لاقانونیت کے دَور میں یہ استبداد کھلے بندوں ہوتا تھا، اور اِس دَورِ دستور و آئین میں یہ، قانون کے پردے میں ہوتا ہے۔ صاحبِ اقتدار طبقے نے جو کچھ کرنا ہوتا ہے، اس سے پہلے وہ، قانون سازی

کی رسم ادا کر لیتا ہے اور پھر یہ شاہ مدار کی بسم اللہ پڑھ کر پھونکی ہوئی چھری جس جانور کے گلے پر پھیر دی جائے وہ ذبیحہ حلال قرار پا جاتا ہے[1]۔ یہ سوال بڑا اہم اور بنیادی ہے جس کا دنیا کو آج تک خاطر خواہ حل نہیں مل سکا کہ انسانی آزادی اور قانون کی پابندی میں ایسی مفاہمت کی صورت کس طرح پیدا کی جائے کہ قانونی پابندیاں بھی اپنی جگہ پر قائم رہیں اور افراد کے حقوق بھی پامال نہ ہوں۔ اس کا حل قرآن کریم نے بتایا۔ اس نے اس ضمن میں پہلے یہ واضح کر دیا کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اُسے کتاب اور حکومت اور نبوت بھی کیوں نہ ملی ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ وہ اس کے محکوم اور تابع فرمان ہو جائیں۔

قرآن کے اس اعلانِ عظیم نے انسانی آزادی کا ایسا بلند منشور عطا کر دیا جس کا تصور بھی ذہنِ انسانی نہیں کر سکتا تھا[2]۔ یہ تو ہوئی کامل آزادی کی شکل۔ اب قانونی پابندی کو دیکھئے۔ اس کے لئے اسی آیت میں پہلے "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کہہ کر یہ بات سمجھائی گئی کہ افراد کی آزادی پر پابندیاں لگانا تو ضروری ہے لیکن یہ پابندیاں کوئی انسان نہیں لگا سکتا۔ اس کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ خدا کی طرف سے یہ پابندیاں کس طرح لگائی جائیں گی؟ کیا یہ وہی تھیاکریسی ہوگی جس میں مذہبی پیشوائیت، خدا کے نام کی آڑ میں، ہر قسم کی من مانی کرتی ہے؟ قرآن نے کہا کہ بالکل نہیں۔ تھیاکریسی تو استبداد کی بدترین شکل ہے، اسی لئے اُس نے فرعون کے ساتھ ہامان کو بھی برابر کا مجرم قرار دیا ہے جو مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ تھا۔ قانونی پابندیوں کے لئے اس نے کہا کہ

وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۸)

خدا نے ان حدود اور پابندیوں کو، جو انسانی آزادی پر عائد کی جائیں گی، اپنی کتاب میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں ہوگا کہ ان پابندیوں میں کسی قسم کی کمی بیشی کر سکے یا ان کے علاوہ کوئی اور پابندی عائد کرے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو یہ اقتدار اور اختیار نہیں کہ وہ کسی انسان کو اپنا محکوم اور تابع فرمان

---

[1] یو۔ پی کے عام دیہات میں یہ رواج تھا — شاید اب بھی ہو — کہ گاؤں کا جاہل مُلّا، جسے ذبح کے وقت تکبیر پڑھنی نہیں آتی تھی، ایک چھری شاہ مدار کی خانقاہ پر لے جاتا۔ وہاں کا مجاور بسم اللہ پڑھ کر چھری پر پھونک دیتا۔ اس چھری سے جو جانور ذبح کیا جاتا اسے حلال سمجھ لیا جاتا۔ سال کے بعد پھر چھری کی تجدید کرائی جاتی۔ [2] ظاہر ہے کہ جو قرآن ایک انسان کو دوسرے انسان کا محکوم بنانے کی بھی اجازت نہیں دیتا، وہ ایک انسان کو دوسرے انسان کا غلام بنانے کی اجازت کب دے گا۔ قرآن نے غلامی کو ختم کر دیا تھا۔ اس کی وضاحت سابقہ تقریر میں کی جا چکی ہے۔

(چہ جائیکہ غلام) بنا سکے۔ اب رہا یہ کہ کتاب اللہ میں بیان کردہ حدود اور پابندیوں کی عملی تشکیل اور تنفیذ کی صورت کس طرح متعین کی جائے۔ تو اس کے لئے واضح طور پر بتا دیا گیا کہ یہ حق بھی کسی خاص گروہ اور جماعت کو نہیں دیا گیا، بلکہ یہ تمام افرادِ معاشرہ کا اجتماعی فریضہ ہے۔ یہ اوران کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے — وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ یہ حقِ مشاورت بھی، بنیادی حقوق کی فہرست میں داخل ہے، جس میں مرد اور عورت، امیر اور غریب، سب شریک ہیں۔ اس مشاورت کی عملی مشینری، اپنے اپنے حالات کے مطابق، خود مرتب کی جا سکتی ہے۔

لہٰذا، قرآن کریم نے یا تو وہ قوانین دے دیئے ہیں جن کی پابندی کرائی جائے گی اور یا وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے افرادِ معاشرہ، باہمی مشاورت سے وقتاً فوقتاً قوانین مرتب کر سکیں گے۔ ان حدود سے تجاوز کرنے، یا ان کے علاوہ، اور حدود وقیود متعین کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مرادف ہوگا جس کی اجازت کسی انسان کو نہیں دی جا سکتی۔ اسے وہ شرک قرار دیتا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (۴۲/۲۱)۔ کیا ان کے کوئی اور شریک ہیں جو ان کے لئے دینِ خداوندی میں ایسے قوانین بناتے ہیں جن کی اجازت خدا نے نہیں دی؟ لہٰذا، انسانی معاشرہ کے لئے کوئی ایسا قانون مرتب نہیں کیا جا سکتا جس کی اجازت قرآن کریم نے نہ دی ہو۔

یہ ہے وہ طریق جس سے، قرآن کریم، انسانی آزادی پر بھی کوئی حرف نہیں آنے دیتا، اور اس کے ساتھ ہی، معاشرہ میں لاقانونیت بھی نہیں پھیلنے پاتی۔ یہ قرآن کے منشورِ حقوقِ انسانیت کی منفرد خصوصیت ہے۔

(۵) حقِ محنت

قرآن کا ارشاد ہے کہ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ (۳۹/۷۰) ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا۔ کوئی کسی کی محنت کے ماحصل کو نہ غصب کر سکے گا، نہ اس میں کمی۔ اسی سلسلہ میں اس نے، دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)۔ بجز ان لوگوں کے جو کام کرنے سے معذور ہوں (جن کا ذکر آگے چل کر آتا ہے)، کوئی شخص محنت اور کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ یعنی اس معاشرہ میں، ایسے خون آشام طبقہ (PARASITES) کے لئے قطعاً گنجائش نہیں ہوگی جو دوسروں کی محنت پر تن آسانی اور عیش پرستی کی زندگی بسر کریں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی کی محنت کو سلب (EXPLOIT) نہیں کر سکے گا، تو ہر کام کرنے والا، اپنی محنت کا پورا پورا معاوضہ پائے گا۔

(۶) عدل واحسان

اسی کا نام عدل ہے۔ یعنی ہر شخص کو اس کا حق مل جانا۔ قرآن کی رو سے عدل ایک بڑی جامع اصطلاح ہے

جس میں ہر قسم کے حقوق کا تحفظ شامل ہے ۔۔۔ جسے ہم قانونی عدل کہتے ہیں۔ اس سے یہی مقصد ہوتا ہے کہ اگر کسی کا کوئی حق غصب ہوتا ہو، تو عدالت کی مشینری اسے وہ حق دلا دے۔ عدل کے معاملہ میں، قرآن اتنا محتاط اور جزرس ہے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ دیکھنا! اس باب میں دوست اور دشمن میں تمیز نہ کرنے لگ جانا۔ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی طرف سے دشمنی کا برتاؤ تمہیں اس پر آمادہ کر دے کہ تم ان کے ساتھ عدل نہ کرو۔ اِعْدِلُوْا۔ وہ کچھ بھی کریں، تم ان کے ساتھ ہمیشہ عدل کرو۔ اس لئے کہ یہ ادلے بدلے کی بات نہیں۔ یہ انسان ہونے کی حیثیت سے ان کا حق، اور اس کی ادائیگی تمہارا فریضہ ہے۔ ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵/۸)۔

لیکن قرآن، عدل تک ہی نہیں رہتا۔ اس سے بھی آگے جاتا ہے (جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے) عدل سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ کسی کا واجب (DUE) ہو، وہ اسے دیدیا جائے۔ لیکن اگر اس سے کسی کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو۔ اس میں کمی رہ جاتی ہو، تو پھر کیا ہو؟ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶/۹۰) اس صورت میں، تم اس کی کمی کو پورا کر کے، اس کے، اور خود معاشرہ کے توازن کو بگڑنے سے بچا لو۔ اسے احسان کہتے ہیں۔ یہ بھی بنیادی حقوقِ انسانیت میں شامل ہے۔ دنیا، ایسے مواقع پر خیرات کی تلقین کرتی ہے، لیکن خیرات سے جس طرح شرفِ انسانیت پامال ہوتا ہے، اور خیرات لینے والے کی عزتِ نفس جس طرح مجروح ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس لئے قرآن نے احسان کو خیرات نہیں قرار دیا بلکہ کہا ہے کہ جس کی کمی رہ جائے وہ اس کمی کو پورا کرنے کے اسباب و ذرائع بطور حق طلب کر سکتا ہے۔ فِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ (۷۰/۲۴-۲۵)۔ وہ لوگ، جن کی محنت سے اُن کی ضروریات پوری نہ ہوں۔ یا جو محنت کرنے سے معذور ہوں، اُن کا، اُن لوگوں کے مال میں حق ہے جن کے پاس ان کی ضروریات سے زیادہ ہے۔ اور یہ حق ڈھکا چھپا نہیں۔ قرآنی معاشرہ میں سب کو معلوم ہے۔ افراد کی ہر قسم کی کمی پوری کرنے کو، بنیادی حقوق کی فہرست میں شامل کرنا قرآن کے علاوہ آپ کو کہیں نظر نہیں آئے گا۔

(۷) رزق کا حق

انسان (بلکہ ہر ذی حیات) کی زندگی کا مدار، سامانِ زیست پر ہے۔ دنیا کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ ہر فرد کی اپنی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے سامانِ زیست خود پیدا یا مہیا کرے۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں ساری دنیا سے منفرد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (۱۱/۶)۔ دنیا میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق یعنی سامانِ زیست کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے کہ جن ذمہ داریوں کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، قرآنی نظام میں وہ ذمہ داریاں خود نظامِ مملکت کی ہو جاتی ہیں۔ لہذا، یہ قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ کوئی ذی حیات اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ اور وہ تمام افرادِ معاشرہ سے علانیہ کہدے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)۔ ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات پوری کرنے کے بھی۔ بنیادی ضروریاتِ زندگی کا پورا کئے جانا، ہر انسان کا بنیادی حق ہے جسے وہ قرآنی نظامِ معاشرہ سے ہر وقت طلب کر سکتا ہے۔ یہ حق آپ کو دنیا کے کسی چارٹر میں نہیں ملیگا۔

جہاں تک اولاد کے لئے رزق مہیا کرنے کا تعلق ہے اس میں ان کی صحیح تعلیم و تربیت بھی شامل ہے کیونکہ جہاں قرآن نے کہا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (۶/۱۵۲)۔ اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو۔ تو اس میں "قتل" کے معنی جان سے مار ڈالنا ہی نہیں۔ اس سے مراد علم و تربیت سے محروم رکھنا بھی ہے۔ لہذا، قرآنی معاشرہ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت ہو۔ بنابریں، قرآن کی رو سے، سب بچے، عمدہ پرورش اور صحیح تعلیم و تربیت بطور اپنے حق کے طلب کر سکتے ہیں، اور کوئی انہیں اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔

(۸) جان کی حفاظت

لیکن ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری سے پہلے، انسانی جان کی حفاظت کی ضمانت سامنے آتی ہے۔ قرآن نے اس باب میں واضح طور پر کہدیا کہ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (۱۷/۳۳)۔ خدا نے انسانی جان کو واجب الاحترام قرار دیا ہے اس لئے کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ کسی کو جان سے مار دے۔ ہاں، اگر حق کا تقاضا ہو تو ایسا کیا جا سکتا ہے۔ حق کے تقاضے کے کیا معنی ہیں، اسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کر دیا کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ اگر کوئی، کسی کو ناحق قتل کر دے، تو اس جرم کی پاداش میں اسے سزائے موت دی جا سکتی ہے۔ یا اگر کوئی شخص معاشرہ کے نظامِ عدل و امن کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرے، اور کسی طرح، اپنی اس تباہ کن روش سے باز نہ آئے، تو اسے بھی موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔ ایسی صورتوں کے علاوہ، اگر کوئی کسی انسانی جان کو ناحق تلف کر دے تو یوں سمجھو کہ اس نے ایک جان کو تلف نہیں کیا، پوری نوعِ انسان کو تلف کر دیا۔ اس کے برعکس وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (۵/۳۲)۔ جس نے کسی ایک انسان کی جان بچائی تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کی جان بچالی۔

آپ نے غور فرمایا کہ جن مخصوص حالات میں قرآن کریم نے، کسی انسان کی جان لینے کی اجازت دی ہے (یعنی قانون کی رُو سے سزائے موت)، وہ بھی درحقیقت عالمگیر انسانی حقوق کی محافظت کے لئے ہے۔ اسی کو باحق کہا گیا ہے۔

(۹) مال کی حفاظت

جان کی حفاظت کے بعد ان چیزوں کی حفاظت بھی بنیادی حقوق میں داخل ہے جو، قانون خداوندی کی رو سے، افراد کے ذاتی تصرف میں رہیں۔ کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ دوسروں کی ان چیزوں کو ناجائز طور پر اپنے تصرف میں لے آئے۔ اسی لئے فرمایا کہ لَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (۲/۱۸۸)۔ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے مت کھاؤ۔ "مال" ایک جامع اصطلاح ہے جس میں ہر قسم کی مقبوضات آجاتی ہیں۔

(۱۰) سکونت کی حفاظت

جان اور مال کی حفاظت کے بعد، قرآن کریم، ہر فرد کو سکونت کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ اس نے یہودیوں کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی ہے اس میں یہ بھی کہا ہے کہ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ (۲/۸۵)۔ تم وہ ہو، جو اپنے لوگوں کو ناحق قتل کر دیتے ہو، اور انہیں ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو۔ لہذا، کسی کو بے گھر بے در، بنا دینا، اس کے اس بنیادی حق کو غصب کر لینا ہے۔

(۱۱) عصمت کی حفاظت

عصمت، انسان کی بے بہا متاع ہے۔ یہ وہ بلند ترین قدر ہے جو صرف انسان کا خاصہ ہے۔ حیوانات میں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جنسی اختلاط ایک طبعی جذبہ ہے جس میں انسان اور حیوان سب شریک ہیں۔ لیکن عصمت کا جذبہ صرف انسانی سطحِ زندگی کا تقاضا ہے۔ لہذا، قرآن اس کی حفاظت کو مستقل حق انسانیت قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اس نے اس حق کی پامالی کو ایک ایسا جرم قرار دیا ہے جس کی سزا بڑی سخت ہے۔ اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (۲۴/۲)۔ زانی مرد ہو یا عورت۔ انہیں سو سو کوڑوں کی سزا دو۔

صرف جرمِ زنا کا ارتکاب ہی نہیں۔ اس کے نزدیک، شریف عورتوں کے خلاف تہمت بے جا بھی سنگین جرم ہے۔ جس کی سزا اسی کوڑے ہے (۲۴/۴)۔ اس لئے کہ اس سے بھی ان کی عصمت پر حرف آجاتا ہے۔

اور شریف زادیوں کو چھیڑنا اور تنگ کرنا۔ ان کے خلاف طعن آمیز اور اضطراب انگیز باتیں پھیلا کر لوگوں کے جذبات کو ان کے خلاف مشتعل کرنا، اس کے نزدیک، اس سے بھی بڑا جرم ہے۔ اس جرم کی پاداش میں، اس نے کہا ہے کہ ایسے لوگوں کو شہر بدر کر دیا جائے۔ انہیں حقوق شہریت سے محروم کر دیا جائے۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو ان کے خلاف وارنٹ بلا ضمانت جاری کر کے انہیں گرفتار کیا جائے اور جرم ثابت ہونے پر انہیں قتل کیا جائے اس طرح کہ ان کی پارٹی کا کوئی فرد بھی سزا سے بچنے نہ پائے۔ وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا (۳۳/۶۱)۔ یہ وہ قانون خداوندی ہے جس کے متعلق کہا کہ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ○ (۳۳/۶۲)۔ یہی قانون، خدا نے اقوام سابقہ کو بھی دیا تھا۔ اور یہ ایسا محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

(۱۲) شادی میں انتخاب کا حق

تعلق زوجین کے سلسلہ میں قرآن کریم نے اس امر کی صراحت بھی کر دی کہ شادی میں، اپنی مرضی سے انتخاب بھی بنیادی حق ہے۔ اس نے مردوں سے کہا کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۳) تم اپنی پسند کی عورتوں سے شادی کرو۔ دوسری طرف یہ کہہ کر عورتوں کے حق انتخاب کی حفاظت کر دی کہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ (۴/۱۹)۔ تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔ نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں فریقین کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔

اس سلسلہ میں، ضمناً اتنا اور واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، معاہدہ نکاح کے بعد خاوند اور بیوی کے حقوق اور ذمہ داریاں یکساں ہوتی ہیں — صرف ایک بات میں مرد کو رعایت دی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ طلاق (یا بیوگی) کی صورت میں، عورت کو عدت کی مدت میں نکاح ثانی کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور مرد کے لئے کوئی عدت نہیں۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یعنی اس دوران میں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ عورت حمل سے تو نہیں۔ یہ حکم، پیدا ہونے والے بچے کے حق کی حفاظت کے لئے ہے یعنی یہ متعین کرنے کے لئے کہ وہ کس کا بچہ ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ (۲/۲۲۸)۔ عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنی ان کی ذمہ داریاں ہیں۔ صرف ایک معاملہ ایسا ہے جس میں مرد کو ایک خصوصی درجہ حاصل ہے۔ اور وہ یہ کہ اسے عدت نہیں گزارنی

پڑتی۔

(۱۳) حُسنِ ذوق کا حق

قرآن، انسان کے انفرادی حسنِ ذوق (AESTHETIC TASTE) کا بڑا احترام کرتا ہے اور کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اُسے، اس کے حق سے محروم کر دے۔ اس نے بڑی تحدی سے کہا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ (۷/۳۲)۔ ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی اُن چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے ذوق کی تسکین کے لئے بنایا ہے، اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دے سکتا ہے؟ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے، ان سے لطف اندوز اور کیف یاب ہونا، ہر فرد کا بنیادی حق ہے جس سے اسے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ اصولاً یہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا، اُسے کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مرادف ہے جس کا حق کسی انسان کو نہیں پہنچتا۔ اسی ضمن میں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کھانے پینے کے انداز اور رہنے سہنے کے طریق پر بھی کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا بلکہ اس میں ہر ایک کو اس کے ذوق کے مطابق حقِ انتخاب دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ تم اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے گھروں میں سے جس کے ہاں جی چاہے کھاؤ پیو، اور خواہ اکھٹے مل بیٹھ کر کھاؤ یا الگ الگ کھاؤ، اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ (۲۴/۶۱) اسی طرح وہ لباس کے معاملہ میں بھی وضع قطع اور تراش خراش پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا اور ہر ایک کے حسنِ ذوق کی رعایت رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لباس کا مقصد ستر پوشی کے علاوہ، زینت بھی ہے۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ (۷/۲۶)۔ وہ سونے کے زیورات۔ چاندی اور شیشے کے برتن۔ باریک اور دبیز ریشمی ملبوسات۔ اعلیٰ درجے کے صوفے (۱۸/۳۱؛ ۷۶/۱۵ — ۷۶/۲۱) اور اسی قسم کا دیگر سامانِ آرائش و زیبائش، جنتی زندگی کا خاصہ قرار دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بحیثیت مجموعی معاشرہ کا تمدنی معیار اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ یہ چیزیں تمام افرادِ معاشرہ کو میسر ہوں۔ جنتی زندگی میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ایک خاص طبقہ ان آسائشوں سے بہرہ یاب ہوگا۔ اور دوسرے لوگ ان سے محروم ہوں گے۔ جنتی زندگی میں ہر ایک کو یہ کچھ میسر ہوگا۔

(۱۴) مذہبی آزادی کا حق

مذہب کے معاملہ میں قرآن، ہر انسان کو پوری آزادی دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان نام ہے

کسی بات کو عقل و فکر کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کا۔ لہٰذا اس میں جور و اکراہ کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ (۱۸/۲۹)۔ ان سے کہدو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے (اس قرآن میں) آچکا ہے۔ تم اس پر غور و فکر کرو، اور اس کے بعد، جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرلے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ خارجی کائنات اور انسان میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اُس راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ لیکن انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اُسے راستہ دکھا دیا گیا ہے اور اس کے بعد، یہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس راستے کو اختیار کرے۔ یا اس سے انحراف برتے۔ وہ اگر اسے اختیار کرے گا تو اس کی زندگی خوشگواریوں میں گزرے گی۔ اس سے سرتابی برتے گا، تو نقصان اُٹھائیگا۔ اگر اُسے مجبوراً صحیح راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو اسے بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح، مجبور پیدا کر دیا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اُسے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اب یہ بات منشائے خداوندی کے خلاف ہوگی کہ اُسے ایک خاص راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ قرآن میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کرکے فرمایا۔ وَ لَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۚ اگر تمہارے خدا کے پروگرام میں یہ ہوتا کہ انسان کو ایمان کے راستے پر مجبوراً چلایا جائے تو اس کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل تھا؟ وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسے کرتا کہ وہ سب کے سب، آنکھ بند کئے، بھیڑ بکریوں کی طرح، اسی راستے پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے انسان کو ایسا پیدا نہیں کیا۔ اسے اس باب میں اختیار دیا گیا ہے۔ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۱۰/۹۹)۔ تو کیا تو انہیں مجبور کرے گا کہ وہ بالضرور ایمان لے آئیں۔ یہ تو مشیتِ خداوندی کے خلاف ہوگا۔ اس لئے تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائے جا۔ اس سے زیادہ کا تو مکلف نہیں۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (۲/۲۵۶)۔ غلط اور صحیح راستہ (اس قرآن کے ذریعے) متمیز ہو کر سامنے آچکا ہے۔ اس کے بعد، دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک مذہب نہیں (مذہب کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا) اس لئے وہ مذاہبِ عالم میں سے کسی کو اپنا حریف نہیں قرار دیتا۔ وہ ایک دین، یعنی ضابطہ زندگی یا مملکتی نظام ہے۔ وہ اس کی اجازت تو نہیں دے سکتا کہ اس کی حدودِ مملکت میں رہنے والے کوئی دوسرا نظامِ مملکت قائم کریں۔ یہ تو "ریاست درونِ ریاست" (STATE WITHIN A STATE) قائم کرنے کے مرادف ہوگا جس کی کہیں بھی اجازت نہیں مل سکتی۔ لیکن وہ اس سے کچھ تعرض نہیں کرتا کہ اس کے حدودِ مملکت میں

رہنے والے اپنے لئے مذہب کو نسا پسند کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں کہ وہ ہر ایک کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے۔ وہ جہاں اپنے نظام کے مراکز یعنی مساجد کی حفاظت کرتا ہے وہاں، تمام اہلِ مذاہب کی پرستش گاہوں کی بھی حفاظت اپنے ذمے لیتا ہے۔ وہ اسلامی مملکت کے وجود کی ایک وجۂ جواز یہ بھی بتاتا ہے کہ وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۔ (۲۲/۴۰)۔ اگر اللہ انسانوں کے ذریعے، سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرتا، تو یقیناً راہبوں کی خانقاہیں۔ عیسائیوں کے گرجے۔ دیگر اقوام کی پرستش گاہیں۔ اور مسجدیں جن میں بکثرت خدا کا نام لیا جاتا ہے ڈھادی جاتیں۔ لہٰذا، ان تمام معبدوں کی حفاظت، قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے، جس کا ہر غیر مسلم، بطور اپنے حق کے مطالبہ کر سکتا ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے جماعتِ مومنین سے تاکیداً کہا ہے کہ وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ تم، غیر مسلموں کے معبودوں کو گالی مت دو۔ تم ایسا کرو گے تو وہ، اس کے مقابلہ میں بربنائے جہالت، اللہ کو گالی دیں گے۔ سو جس طرح تمہیں یہ بُرا لگے گا۔ اسی طرح انہیں، ان کے معبودوں کو تمہارا گالی دینا بھی بُرا لگتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ہر ایک کو اپنا اپنا مسلک اور اپنا اپنا معبود پسند ہوتا ہے۔ تم ان تک حق کی بات پہنچاؤ۔ جب یہ برہنائے علم و بصیرت، غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کے قابل ہو جائیں گے، تو خود بخود، اپنے معبودانِ باطل کو چھوڑ کر، صحیح نظامِ زندگی اختیار کر لیں گے۔

لہٰذا، قرآن، نوعِ انسان کو، مذہبی آزادی کا حق ہی نہیں دیتا۔ بلکہ اس کی بھی ضمانت دیتا ہے کہ کوئی ان کے معبودوں کے خلاف زبان درازی یا ان کی شان میں گستاخی نہ کرے۔

اس مقام پر میں، آپ حضرات سے، اپنے موضوع سے ذرا سے گریز (DIGRESSION) کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ خدا نے تو مذہب کے معاملہ میں انسان کو اس قدر آزادی عطا کی ہے، لیکن ہمارے اربابِ شریعت کا فتویٰ ہے کہ غیر مسلموں کو تو اس کا حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ چاہے اپنے مذہب پر رہیں اور چاہے اسے تبدیل کر لیں لیکن ایک مسلمان کو اس کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ اگر مسلمان مذہب تبدیل کرے گا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ یہی نہیں کہ اگر وہ اسلام چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لے تو اسے قتل کر دیا جائے گا، بلکہ یہاں تک بھی کہ اگر کسی معاملہ میں اُس کے خیالات ان حضرات سے مختلف ہوں اور اس بنا پر یہ اُسے مرتد قرار دیدیں، تو بھی اُسے قتل کر دیا جائیگا۔

اس سلسلہ میں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اس وقت پاکستان میں جس قدر مسلمان بستے ہیں، اگر کل کو یہاں، ان حضرات کے تصور کا اسلامی نظام قائم ہو گیا، تو ان بد بخت مسلمانوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا۔

اس ضمن میں، سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیے - وہ اپنے رسالہ "مرتد کی سزا" کے صفحہ ۸۰ پر ارشاد فرماتے ہیں۔

> میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے (واللہ الموفق للصواب) کہ جس علاقے میں اسلامی انقلاب رونما ہو، وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دیدیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً وعملاً منحرف ہو چکے ہیں اور وہ منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے اجتماعی نظام سے باہر نکل جائیں - اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا - تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے - فرائض وواجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا - اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے، بچا لیا جائے - پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے - اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔

یعنی صرف اُنہیں زندہ رکھا جائے جو ان حضرات سے متفق الخیال ہوں - جو ان سے اختلاف کریں، انہیں زیادہ سے زیادہ، ایک سال تک زندہ رہنے کی اجازت دی جائے - اس کے بعد یا وہ (مثلاً) ہندو یا عیسائی ہو جائیں اور یا اپنی گردن ان کی تلوار کے سامنے جھکا دیں - یہ بھی یاد رہے کہ اگر وہ اس وقت ان کے ہم خیال بھی ہو جائیں تو بھی انہیں ساری عمر اطمینان سے جینے کی اجازت نہیں ہوگی - اس کے بعد بھی جس وقت یہ حضرات کہدیں کہ اُس کا فلاں عقیدہ، اِن کے خیال کے مطابق، اسلام کے خلاف ہے، اُسے مرتد قرار دے کر قتل کیا جا سکتا ہے۔
یہ ہوگی مسلمانوں کی حالت اُس اسلامی نظام میں جسے یہ حضرات پاکستان میں قائم کرنے کے درپے ہیں!

اس گریز کے بعد، میں پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں - قرآن کی رُو سے، اگلا بنیادی حق ہے -

(۱۵) سچی بات کہنے کا حق

قرآن کریم نے افراد کو سچی بات کہنے کا حق ہی عطا نہیں کیا بلکہ اس کا حکم دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے

اسے افراد کی مرضی پر نہیں چھوڑا کہ وہ حق بات کہیں یا نہ کہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ وہ، جہاں بھی ضرورت ہو، حق بات کہنے کے لئے اپنے آپ کو خود پیش کریں۔ اب یہ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کریم کہاں تک جاتا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ ۔ اے جماعت مومنین! تمہارا فریضہ ہے کہ تم عدل و انصاف کو دنیا میں قائم رکھو۔ اس کے لئے بنیادی ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ سچی بات بلا رو رعایت کی جائے۔ اس ضمن میں تم سمجھ لو کہ جب کسی معاملہ کے متعلق کچھ کہنے کا وقت آئے تو یہ نہ خیال کرو کہ تم کسی پارٹی یا فریق کی طرف سے شہادت دینے کے لئے آئے ہو۔ تم یہ سمجھو کہ تم صرف اپنے خدا کی طرف سے شاہد بن کر آئے ہو۔۔۔ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ ۔ پھر سچی بات کہو وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ ۔ خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے (آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں قرآن انسان کو کس مقام تک لیجاتا ہے!)۔ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ ۚ خواہ وہ تمہارے والدین یا دیگر عزیز رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ جائے۔ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا ۔ جس کے خلاف بات جاتی ہے، وہ امیر ہو یا غریب، اس کی پرواہ مت کرو۔ اس لئے کہ فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا ۔ اللہ کا حق ان دونوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ یاد رکھو! اپنے مفاد کا تحفظ۔ عزیز رشتہ داروں کی محبت اور تعلقات۔ اس پارٹی سے نقصان کا احتمال جو دولتمند ہے۔ یہ تمام جذبات تمہاری راہ روک کر کھڑے ہو سکتے ہیں لیکن فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ تم ان جذبات کا اتباع قطعاً نہ کرو اور ہمیشہ عدل کے تقاضے کو ملحوظ رکھو۔ وَ اِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝ (۴/۱۳۵)۔ نہ ہی تم توڑ مروڑ کر دو معنی بات کرو۔ اور نہ ہی اس سے پہلو تہی کرو۔ ایسا کرنے سے ہو سکتا ہے کہ تم دوسرے لوگوں کو دھوکا دے سکو، لیکن تم اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اسے سب کچھ معلوم ہے۔ اس لئے سچی بات کہنے کے لئے دھڑلے سے سامنے آؤ اور لگی لپٹی بغیر، صاف صاف دو ٹوک بات کرو۔

ادھر یہ کہا۔ اور دوسری طرف معاشرہ سے تاکید کی کہ اس کا انتظام کرو کہ حق بات کی شہادت دینے والے کو کوئی کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائے۔ وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّ لَا شَھِیْدٌ ۚ (۲/۲۸۲)۔

(۱۶) مظلوم کو فریاد کا حق

قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم کسی کی برائی کی خواہ مخواہ تشہیر مت کرو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے مظلوم کو اس کا حق دیا ہے کہ اس کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے وہ، اس کے مداوا کے لئے، اس کا اعلان اور فریاد کر سکتا ہے لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۚ (۴/۱۴۸)۔ اللہ اسے پسند نہیں کرتا کہ تم بری بات کی خواہ مخواہ تشہیر کرتے پھرو (یہ ارباب نظم و نسق کا کام ہے کہ وہ اس برائی کے انسداد کا بندوبست کریں)۔ ہاں!

جس شخص پر کوئی زیادتی ہوئی ہو، وہ اس کا چرچا کر سکتا ہے تاکہ اس زیادتی کا مداوا ہو سکے۔

(۱۷) رازوں کی حفاظت کا حق

قرآن کریم نے اس سے منع کیا ہے کہ کسی کے رازوں کی خواہ مخواہ ٹوہ لگائی جائے وَلَا تَجَسَّسُوْا (۴۹/۱۲) اس کا ارشاد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ افراد کو اس کا حق دیتا ہے کہ ان کے راز، افشا نہیں کئے جائیں گے۔ (جرائم کی تحقیق کے سلسلہ میں ایسا کرنا کچھ اور معنی رکھتا ہے)۔ خط و کتابت کی حفاظت کا حق بھی اسی ذیل میں آجاتا ہے۔ اسی طرح وہ، ہر شخص کو پرائیویسی کا حق بھی دیتا ہے جب کہتا ہے کہ لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا (۲۴/۲۷)۔ تم اپنے گھروں کے علاوہ، کسی اور کے گھر میں، ان کی اجازت کے بغیر مت داخل ہو۔

(۱۸) حیثیتِ عرفی کے تحفظ کا حق

جس چیز کو عام طور پر حیثیتِ عرفی کہا جاتا ہے، قرآن اس کی حفاظت کا بھی حق دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ (۴/۱۴۸)۔ اللہ اسے پسند نہیں کرتا کہ کسی کی بری بات کو خواہ مخواہ اچھالا جائے۔ اس کی اصلاح مطلوب ہو تو خاموشی سے ایسا کیا جائے۔ پھر ارشاد ہے کہ لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (۴۹/۱۱)۔ کوئی پارٹی کسی دوسری پارٹی کا مذاق نہ اڑائے۔ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ کسی کے الٹے پلٹے نام نہ رکھے جائیں۔ محض ظن اور گمان کی بنا پر کسی کو مطعون نہ کیا جائے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ (۴۹/۱۲)۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب تک کسی کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے، اسے مجرم نہ سمجھا جائے، بلکہ کہا یہ جائے کہ ھٰذَآ اِفْکٌ مُّبِیْنٌ (۲۴/۱۲) وَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ (۲۴/۱۶) اور یہی نہیں کہ ظن اور قیاس کی بنا پر کسی کے سامنے اس کی برائی نہ کی جائے، بلکہ اس کی پیٹھ پیچھے بھی ایسا نہ کیا جائے کہ یہ غیبت ہوگی۔ اور غیبت سے قرآن نے سختی سے روکا ہے وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا (۴۹/۱۲) اس قسم کے تاکیدی احکامات سے، قرآن، افراد کی حیثیتِ عرفی کا تحفظ کرتا ہے۔

(۱۹) امن کی ضمانت

ان تمام حقوق سے آگے بڑھ کر، قرآن کریم یہ ضمانت دیتا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)۔ انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ خوف خارجی خطرات کی طرف سے اندیشہ کا نام ہے۔ لہذا، اس معاشرہ میں، ہر فرد، ہر قسم کے بیرونی خطرات سے محفوظ ہوگا۔ اور حزن، اس افسردگی کو کہتے

ہیں جو پریشانیوں کی وجہ سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ لہذا، جہاں اس معاشرہ کا یہ فریضہ ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افراد معاشرہ، بیرونی خطرات سے امن میں رہیں، وہاں اس کی یہ ذمہ داری بھی ہوگی کہ وہ اُن پریشانیوں کو دُور کرے جو لوگوں کے لئے وجۂ افسردگی بنتی ہیں۔ خوف اور حزن سے مامونیت، ایسی جامع کیفیت ہے جس میں داخلی اور خارجی، ہر قسم کے اندیشوں اور پریشانیوں سے حفاظت کا تصور آجاتا ہے۔ اسی حفاظت میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ([illegible])۔ اس میں کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ فریضہ کسی کا ہو اور اسے سرانجام کوئی اور دے؟ کام کسی کا ہو اور مفت میں بیگار کوئی اور بھگتے۔ جرم کسی نے کیا ہو اور دھبہ کسی اور کو لگا ہوا ہو۔ یہ ہے امن کی وہ ضمانت جس سے ہر شخص کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ ہیں، برادرانِ عزیز! وہ بنیادی حقوق جنہیں قرآن، حقوقِ انسانیت کی حیثیت سے تسلیم کرتا اور جن کی ضمانت قرآنی معاشرہ دیتا ہے۔ یہ صرف بڑے بڑے حقوق کی فہرست ہے، ورنہ چھوٹے چھوٹے کئی اور حقوق ہیں جن کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ آپ ان حقوق کو سامنے رکھئے، اور پھر ان کا موازنہ ان حقوق سے کیجئے جن کا

حقوق کا موازنہ

ذکر اقوامِ متحدہ (U.N.O) کے چارٹر میں کیا گیا ہے۔ آپ پر یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی کہ انسانی فکر اپنی (اس وقت تک کی) انتہائی بلندیوں کے باوجود، کہاں تک جا سکا ہے۔ اور وحیِ خداوندی، اس باب میں، انسان کو کہاں سے جاتی ہے ۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ وحیِ خداوندی (قرآنِ کریم) نے انسانوں کو یہ حقوق اس زمانے (چھٹی صدی عیسوی) میں عطا کئے تھے جب انسان، اپنے بنیادی حقوق کے تصور تک سے ناآشنا تھا۔

قرآنی حقوقِ انسانیت کی فہرست کا، اقوامِ متحدہ کے مرتب کردہ منشور کے ساتھ موازنہ کے بعد، ایک اور اہم حقیقت پر بھی غور کیجئے۔ جس زمانے میں یو۔ این۔ او کا منشور زیرِ تحقیق تھا، انجمن اقوامِ متحدہ کی (Educational, Scientific & Cultural Organisation) نے (جسے عام طور پر UNESCO کہا جاتا ہے)، اس موضوع پر ایک سوالنامہ مرتب کیا اور اُسے دنیا بھر کے مشہور اربابِ فکر و نظر کے پاس بھیجا کہ وہ ان حقوق کے متعلق اپنی آراء کا اظہار کریں۔ (UNESCO) نے ان میں سے بلند پایہ مشاہیر کے مقالات کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا جس کا تعارف (JACQUES MARITAIN) نے لکھا ہے۔ ان مقالات میں جس بات کو نمایاں طور پر تسلیم کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے کوئی حقوقِ مطلق (ABSOLUTE) ہیں ہی نہیں۔

کوئی حق مطلق نہیں

مسٹر (MARITAIN) کے الفاظ میں۔

> یہ حقیقت بدیہی ہے کہ تمام حقوق، بالآخر انسانی حقوق ہیں (خدائی حقوق نہیں) اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عائد کی جائیں اور انہیں قابلِ ترمیم و تبدل قرار دیا جائے۔ حتیٰ کہ جن حقوق کو بلا مشروط کہا جاتا ہے، ان میں بھی ان حقوق کے مالک ہونے میں، اور ان کے استعمال کا حق رکھنے میں بنیادی فرق بجا ملکیت بجا ہے۔ لیکن ان کا استعمال، ان حدود اور پابندیوں کے مطابق ہوگا جو ان پر از روئے عدل عائد کی جائیں گی۔

لیجئے! ایک ہی تشریح نے، بنیادی حقوقِ انسانیت کی رفیع الشان عمارت، دھڑام سے نیچے گرا دی۔ انسان جس بات کی ضمانت چاہتا ہے ـــ اور جس ضمانت سے اسے حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے ـــ وہ یہ ہے کہ اس کے

مشروط حقوق

کچھ حقوق ایسے ہیں جو اسے محض انسان ہونے کی حیثیت سے بلا مشروط حاصل ہیں۔ نہ ان حقوق میں کوئی رد و بدل کر سکتا ہے، نہ ان پر کوئی حدود و قیود عائد کر سکتا ہے۔ لیکن جب ایک طرف اس کے ہاتھ میں حقوق کی فہرست دیدی جائے، اور دوسری طرف اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ اربابِ اقتدار (Party in Power) کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ "از روئے عدل" ان حقوق پر جو پابندیاں چاہے لگا دے، تو اس سے اسے خاک اطمینان حاصل ہوگا! وہ اربابِ اقتدار کی دخل اندازی سے بچنے کے لئے ہی تو حقوق چاہتا تھا۔ اگر وہ دخل اندازی بدستور رہے، تو اُسے اس قسم کے حقوق سے حاصل کیا ہوگا؟ مختلف اقوامِ عالم کے ہاں، اربابِ اقتدار کے ہاتھوں، ان حقوق کی جس قدر مٹی پلید ہوتی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اور یہ سب کچھ "عدل و انصاف" کی خاطر، اور آئین و قانون کے نام سے، کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے اس باب میں، بات بالکل واضح کر دی۔ اس نے بیشتر حقوق کو حقوقِ مطلق قرار دیا جن پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی (مثلاً رزق، یعنی بنیادی ضروریاتِ زندگی حاصل ہونے کا حق۔ احترامِ انسانیت کا حق۔ صحیح تعلیم و تربیت کا حق۔ عدل و احسان کا حق۔ تحفظِ عصمت کا حق۔ اور اسی قسم کے دیگر حقوق جو یکسر غیر مشروط ہیں)۔ اور جو حقوق مشروط ہیں، ان کی شرائط اور حدود کو بھی خود ہی متعین کر دیا۔ اور ان دونوں چیزوں کو یہ کہہ کر مکمل اور غیر متبدل قرار دیدیا کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵)۔ تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اب ان امور میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں۔ اسی مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات کا نام قرآن ہے، جو دنیا میں حقوقِ انسانیت کا واحد ضامن ہے۔

یہ تو رہا ان حقوق کے مشروط اور قابلِ تغیر و تبدل ہونے کے متعلق جو اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں مذکور ہیں۔

اس کے بعد اس سے بھی زیادہ اہم بات سامنے آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہرچند اس چارٹر کو اقوام عالم کے نمائندوں نے منظور اور تسلیم کیا ہے۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ قومیں اس پر عمل بھی کریں گی۔ اس ضمن میں، شکاگو یونیورسٹی کا پروفیسر

اقوام اس چارٹر پر عمل نہیں کرتیں

(QUINCY WRIGHT) اپنے مقالہ میں لکھتا ہے۔

> تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر حال میں حقوق انسانیت کا احترام کرے گی۔ گذشتہ دنوں، اقلیتوں پر جس قدر مظالم کئے گئے ہیں اس سے انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔ اگر مجلس اقوام متحدہ فی الواقعہ چاہتی ہے کہ ان حقوق کا احترام ہو تو اسے چاہیئے کہ یہ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے اور اقوام عالم کے اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) کے تصور میں اس کے مطابق تبدیلی پیدا کرے۔

پروفیسر رائٹ، ان حقوق کے تحفظ کے لئے، یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اقوام عالم اس باب میں اپنے اقتدار اعلیٰ کو، اقوام متحدہ کی تحویل میں دیدے، اور ہمیں سیاسی افق پر یہ دکھائی دیتا ہے کہ مرحوم لیگ اوف نیشنز کی طرح، انجمن اقوام متحدہ کا وجود ہی خطرہ میں ہے۔ کئی اقوام نے انجمن کو اپنے واجبات تک ادا نہیں کئے۔

اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب حالات یہ ہیں تو پھر وہ کونسی صورت ہے جس میں، ان حقوق کے احترام اور تحفظ کا خاطر خواہ انتظام ہو سکتا ہے۔ اس باب میں مسٹر (MARITAIN) نے اپنے تعارفی مقالہ میں جو کچھ کہا ہے وہ قابل غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

پس چہ باید کرد

> انسانیت کے حقوق کی تعریف (Definition) نہیں، بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے، سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے۔ حقوقِ انسانیت کے احترام کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک، انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو۔ اسی کو "فلسفۂ زندگی" کہتے ہیں۔

یعنی احترام حقوقِ انسانیت کے لئے ضروری ہے کہ تمام اقوام کا فلسفۂ زندگی (یا آئیڈیالوجی) مشترک ہو۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا تحفظ حقوقِ انسانیت کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ قرآن کریم اس کو ایمان کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ تمام نوع انسان کے لئے، اقدار (Values) کے یکساں پیمانے مقرر کرتا ہے۔ وہ عالمگیر انسانیت کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ

لہ ان تمام امور کی وضاحت کے لئے میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" میں سیاست سے متعلق باب دیکھئے۔

وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۱۰/۵۷)۔

اے نوعِ انسان! تمہارے پاس، تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، ایک ضابطۂ ہدایت آ گیا ہے۔ اس میں ہر اس نفسیاتی کشمکش کا علاج ہے جو انسانوں کے دل کو وقفِ اضطراب رکھتی اور اس طرح ان کے معاشرہ میں فساد پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ جو لوگ اس ضابطہ کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، یہ اُن پر کامیابیوں اور خوشگواریوں کی راہیں کشادہ کر دیتا ہے۔

اس ایمان کی بنیاد اس علیٰ وجہ البصیرت یقین پر ہے کہ انسان (یا اقوام) کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے متعین ہوتا ہے، اور اسی کے مطابق اقوام کی موت اور حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جو قومیں حقوقِ انسانیت کا احترام اور تحفظ نہیں کرتیں، وہ تباہ اور برباد ہو کر رہ جاتی ہیں، اور ان کا عسکری ساز و سامان، اور سیاسی مہرہ بازیاں، انہیں اس تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو نہ کبھی کسی کی خاطر بدلا ہے، نہ کبھی بدلے گا۔ یہی وہ ایمان (یا فلسفۂ زندگی) ہے جس سے حقوقِ انسانیت کا تحفظ ہو سکتا ہے ——— اسی ایمان کو ایک زندہ حقیقت بنانے اور اسے عملی

پاکستان کی ضرورت

پیکر میں لانے کے لئے، ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا، تاکہ اس آزاد مملکت میں انسانی حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ان حقوق کا تحفظ ہے، بلکہ اس کی ہستی کی وجۂ جواز ہی یہ ہے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے طلوعِ اسلام نے تحریکِ پاکستان کی اس شد و مد سے حمایت کی تھی، اور یہی وہ نصب العین ہے جس کی طرف اب یہ گذشتہ پندرہ سولہ برس سے مسلسل دعوت دیتا چلا آ رہا ہے۔ یہ مقصدِ عظیم اُس وقت حاصل ہو گا جب اس خطۂ زمین میں، قرآنی نظامِ زندگی قائم ہو گا کہ وہی، اور صرف وہی نظام، احترامِ آدمیت کا ضامن اور حقوقِ انسانیت کا محافظ ہو سکتا ہے۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

مجالسِ اقبالؒ

مثنوی: — پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق

سابقہ قسط میں (جو اپریل کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی) فقر کے متعلق تمہیدی تشریحات سامنے آئی تھیں اس کے بعد قرآنی اور غیر قرآنی فقر کا فرق بیان کیا گیا ہے۔ اس نکتہ کو پھر دہرا دیا جائے کہ جس طرح قرآن کریم کی اپنی مخصوص اصطلاحات ہیں، اسی طرح اقبالؒ نے بھی قدیم الفاظ اور اصطلاحات کو نئے معانی پہنائے ہیں۔ پیامِ اقبالؒ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان مخصوص معانی کو سمجھ لیا جائے جن میں ان قدیم الفاظ و اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ہے۔ قرآنی فقر سے مفہوم یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا جائے اور انہیں نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے اس طرح عام کر دیا جائے کہ اگر ان میں سے اپنے لئے کچھ بھی نہ رہے تو اس محرومی کا احساس تک نہ ہونے پائے۔ بلکہ انسان مطمئن ہو کہ اس نے دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دی ہے اور یہی قرآن کی تعلیم ہے — "یؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ" مومن کی خصوصیت ہے — قرآنی فقر کے متعلق حضرت علامہؒ لکھتے ہیں:-

فقرِ قرآں احتسابِ ہست و بود | نے ربابِ و مستی و رقص و سرود

جماعتِ مومنین کے متعلق قرآن میں ہے کہ انہیں شہداء علی الناس پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی ان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کا محاسبہ کریں۔ ان پر نگراں رہیں یہ دیکھنے کے لئے کہ ان میں سے کوئی عدل و انصاف کی راہ کو تو نہیں چھوڑتا۔ اقبالؒ کہتا ہے کہ قرآنی فقر سے مراد ہے پوری کائنات کا محاسبہ کرنا۔ کائنات میں اشیائے فطرت بھی آ جائیں گی۔ اور اقوامِ عالم بھی — اسی کا نام ہے فقر۔ ذکر قوالی اور وجد اور حال — قوالی اور وجد کو تو صوفیوں کے اکثر سالک میں جزوِ عبادت قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن مولانا رومؒ کی طرف منسوب کردہ طریقِ تصوف میں، اس کے ساتھ رقص بھی شامل ہے۔ اس طریق میں درویش رقص بھی کرتے ہیں۔

فقر مومن چیست تسخیر جہات بندہ از تاثیر او مولا صفات

اس شعر میں مزید وضاحت ہو گئی ہے کہ مومن کا فقر فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتا ہے لیکن یہ تسخیر فطرت مغرب کی مادہ پرست اقوام کی نہیں جس کا نتیجہ ایک دوسرے کی تباہی اور بربادی ہے۔ مومن خارجی کائنات میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی قرآن کی تربیت سے اپنے اندر ایسی تبدیلی کرتا چلا جاتا ہے جس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ ذات کی نشوونما کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں اللہ تعالیٰ کی صفات (بحد بشریت) منعکس ہوتی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت کی یہ قوتیں نوع انسان کی نشوونما میں صرف ہوتی ہیں۔ ملوکیت کی تخریب کے لئے۔ اس لئے کہ اللہ کی جس صفت کا قرآن نے سب سے پہلے ذکر کیا ہے وہ صفت رب العالمینی ہے۔ جو جماعت خدا کی اس صفت کی مظہر ہوگی اس کا فریضہ انسانیت کی عالمگیر نشوونما ہوگا۔

فقر کافر خلوت دشت و در است فقر مومن لرزۂ بحر و بر است

خانقاہوں اور حجروں کے اندر مراقبوں میں بیٹھ جانا۔ یا باہر جنگلوں، پہاڑوں اور ویرانوں میں چلے کاٹنا ــــ یا ترک دنیا کو مقصود روحانیت سمجھ لینا ــــ اقبالؒ کے الفاظ میں فقر کافر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ــــ تصوف اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے۔ مومن کا فقر وہ ہے جس سے خشکی اور تری (ساری کائنات) میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے۔

زندگی آں را سکونِ غار و کوہ زندگی ایں را ز مرگِ با شکوہ

اس فقر (یعنی فقر کافر) کی رو سے زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسان، پہاڑوں اور غاروں میں جا کر سکون قلب کی تلاش اور منازل روحانیت کو طے کرے۔ یہ فریب نفس ہے جو کشمکش زندگی سے فرار کو تقدس کے نقاب میں چھپاتا ہے۔ مومن کا فقر یہ ہے کہ باطل کا ہر آن مقابلہ کیا جائے اور اس کے لئے عند الضرورت کفن بردوش اور شمشیر بکف میدان جنگ میں نکل آئے۔ اسی کا نام مرگ باشکوہ یا مرگ باشرف ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک زندگی نام ہی مرگ باشرف کا ہے۔ حیات بے شرف موت ہے۔

آں خدا را جستن از ترک بدن ایں خودی را بر فسانِ حق زدن

تصوف میں ترک دنیا سے خدا کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ رہبانیت ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ یہ لوگوں کا خود ساختہ مسلک ہے۔ خدا کا تجویز کردہ نہیں۔ اسلام ترک دنیا نہیں سکھاتا۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان قوانین خداوندی کے اتباع سے اپنی خودی (ذات) کو مستحکم سے مستحکم تر کرتا چلا جائے اور اس کے زور دروں سے کائنات کو مغلوب و مفتوح بنائے۔

آں خودی را کشتن و وا سوختن ایں خودی را چوں چراغ افروختن

تصوف کا مقصود منتہی انسانی ذات کو اس طرح فنا کر دینا ہے کہ وہ ذات خداوندی میں جذب ہو جائے اور اس طرح جزو ذاتی

اصل سے مل جائے۔ لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے، قندیلِ خودی کو تابندہ سے تابندہ تر کیا جائے۔ اس کی مضمر صلاحیتوں کو اسطرح مشہود کیا جائے کہ یہ حیاتِ جاودان حاصل کرے۔

فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر　　از نہیبِ او بلرزد ماہ و مہر

جب جماعتِ مومنین ان مقاصدِ حیات کو لے کر باہر نکلتی ہے تو اس کی ہیبت سے چاند اور سورج تک پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ یہ فقر، سربزیری، بیکسی اور بے بسی، محتاجی اور مسکینی نہیں۔ یہ تقدیر شکن قوت کا نام ہے جس کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔

فقرِ عریاں گرمئ بدر و حنین　　فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؓ

اس فقر کے مظاہرے بدر و حنین کے میدانوں میں ہوئے تھے۔ جب جماعتِ مومنین، حق کی مدافعت کے لئے سر بکف باہر آگئی تھی۔ اس فقر نے وہاں کیا کیا معجزات دکھائے۔ اس پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔ فقر کے باہر آنے سے مراد یہ ہے کہ انسان باطل کا چیلنج قبول کرے۔ اور تبسم برلب موت کو گلے لگا لے۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے　　لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

یہ ہے فقرِ قرآں جس کے مظاہرے محمد رسول اللہ و الذین معہ کے دور ہمایوں میں ہوئے۔ اس کے بعد

فقرِ قرآں تا ذوقِ عریانی نماند　　آں جلال اندر مسلمانی نماند

جب مسلمانوں میں ایمان کی وہ شان باقی نہ رہی تو ان کی قوت بھی ختم ہو گئی۔ پھر دنیا کی پست ترین اور کمزور ترین قوموں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ اور اس کے بعد آج تک یہی حالت چلی آ رہی ہے۔ بلکہ دن بدن بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی ہے

وائے ما اے وائے ایں دیرِ کہن　　تیغِ لا در کف نہ تو داری نہ من

اب علامہ، مسلمانِ عصرِ حاضر سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ ہماری کس قدر بدقسمتی اور حرماں نصیبی ہے کہ وہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم جس سے باطل کی ہر قوت کو فنا کرنا تھا اب ہم میں سے کسی کے پاس بھی موجود نہیں۔ — لا کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں باطل کی کوئی قوت باقی نہ رہے۔ اور الا سے مفہوم یہ ہے کہ ہر جگہ قوانینِ خداوندی کی حکمرانی ہو۔ مسلمان کا فریضۂ زندگی یہ تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے بے پناہ قوت کی ضرورت ہے۔ اور وہ قوت اب دنیا میں کسی مسلمان کے ہاں بھی نظر نہیں آتی۔

دل ز غیر اللہ بپرداز اے جواں!　　ایں جہانِ کہنہ در باز اے جواں

علامہ اقبالؒ، قوم کی حیاتِ تازہ اور نشاۃِ ثانیہ کے لئے ہمیشہ نوجوانانِ ملت کو مخاطب کرتے ہیں وہ انہی سے اپنی توقعات وابستہ رکھتے ہیں۔ انہی کے متعلق ان کا یقین ہے کہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

اس لئے اس کیفیت کو بیان کرنے کے بعد، وہ نوجوانانِ ملت سے کہتے ہیں کہ تم باطل کی قوتوں سے منہ موڑ لو اور دنیا کے ان دروازوں کو دوبارہ کھول دو جن کے راستے کاروانِ انسانیت نے ترقی کرتے ہوئے آگے بڑھنا تھا اور جو مدتوں سے بند پڑے ہیں۔

"تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن — اے مسلماں! مردن است ایں زیستن

دین کی غیرت کے بغیر کب تک جیو گے۔ یہ زندگی، زندگی نہیں۔ موت ہے۔ حیاتِ بے شرف سے مرگِ باشرف ہزار درجہ بہتر ہے۔

مردِ حق باز آفریند خویش را — جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را

قرآن پر ایمان رکھنے والا اپنے اندر ایک نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو — اپنے ارادوں اور تمناؤں اور اعمال و افعال کو — ہمیشہ وحیٔ خداوندی کی روشنی میں دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اندر حیاتِ نو بھی پیدا کر لیتا ہے اور قدم قدم پر اپنا محاسبہ بھی کرتا رہتا ہے۔

بر عیارِ مصطفیٰؐ خود را زند — تا جہانے دیگرے پیدا کند

وہ حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے سامنے بطور معیار رکھتا ہے اور اپنی سیرت کو اسی قالب میں ڈھالتا ہے۔ اس طرح جب اس کے اندر ایک داخلی انقلاب پیدا ہو جاتا ہے تو پھر باہر بھی ایک نئی دُنیا پیدا کر لیتا ہے۔ قرآن کی تو کیفیت یہ ہے کہ

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شد۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ امتِ مرحومہ کی داستانِ دلخراش بیان کرتے ہیں کہ یہ کیا تھی، اور اب کیا ہو گئی۔

آہ ازاں قومے کہ از پا بر فتاد — میر و سلطاں زاد و درویشے نزاد

کس قدر تاسف انگیز ہے داستاں اس قوم کی جو اپنے مقامِ بلند سے نیچے گری تو پھر گرتی ہی چلی گئی۔ دوبارہ اٹھی نہیں۔ اس کے اس گرنے کا نتیجہ ہے کہ اس میں بڑے بڑے بادشاہ۔ زمیندار۔ جاگیردار۔ سرمایہ پرست تو بہت پیدا ہوئے لیکن مردِ مومن ایک بھی پیدا نہ ہوا۔

داستانِ او مپرس از من کہ من — چوں بگویم آنچہ ناید در سخن
در گلویم گریہ ہا گردد گرہ — ایں قیامت اندرونِ سینہ بہ

آپ اس کی جگر خراش داستان کو مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ مجھ میں ہمت ہی نہیں کہ میں اسے الفاظ میں بیان کر سکوں۔ جب بھی میں اس کی کوشش کرتا ہوں تو غم کی شدت کچھ اس طرح میرے گلوگیر ہو جاتی ہے کہ میں زبان سے ایک حرف بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے آپ مجھے مجبور نہ کریں کہ میں اس حدیثِ الم انگیز کو الفاظ میں بیان کروں۔ یہ قیامت میرے سینے کے اندر ہی رہے تو بہتر ہے۔

مسلمِ ایں کشور از خود ناامید — عمرہا شد با خدا مردے ندید

باقی دنیا کے مسلم ممالک کو چھوڑ لیجئے۔ اس برصغیر ہند و پاک کی حالت یہ ہے کہ یہاں کا مسلم اپنے مستقبل کی طرف سے یکسر ناامید ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مدتیں گزر گئیں یہاں کوئی مردِ مومن پیدا ہی نہیں ہوا — اور ظاہر ہے کہ جس سرزمین

ہیں مدت سے کوئی انسان پیدا نہ ہوا ہو، اس کی حیاتِ نو کے متعلق کیا امید کی جاسکتی ہے۔

لاجرم از قوتِ دیں بدظن است کاروانِ خویش را خود رہزن است

یہی نہیں کہ اس کے بازوؤں میں، مخالفین کا مقابلہ کرنے کی قوت نہیں رہی، یہ اسلام کے متعلق نا امید ہو چکا ہے۔ اسے اس کا یقین ہی نہیں رہا کہ اسلام ایک قوتِ متحرکہ ہے جو اسے نہ صرف دنیا کی زندہ قوموں کی صف میں کھڑا کر سکتی ہے، بلکہ اسے نوعِ انسان کی امامت کا مستحق بنا سکتی ہے۔ یہ دین کی صلاحیتوں کی طرف سے بدظن ہو چکا ہے۔ اسے اس پر ایمان ہی نہیں رہا۔ دین کی طرف سے اس قسم کی بدظنی عوام میں نہیں، بلکہ ان کے خواص کے دل کی گہرائیوں میں گھر کر گئی۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے بڑے بڑے جید علماء ایک آزاد مملکت کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے بجائے، ہندوستان کی سیکولر حکومت کے تابع زندگی بسر کرنے پہ مطمئن ہو گئے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ حضرات اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے چنانچہ اس کی شہادت ان علماء کے قافلہ کے سرخیل مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے اس بیان سے ملتی ہے جو ان کی آخری تصنیف (انڈیا ونز فریڈم) میں ہے۔ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ اسلام کی رو سے انسانوں میں وجۂ جامعیت آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے۔ زبان، رنگ، نسل، جغرافیائی حدود کا اشتراک نہیں۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے مسلمان دوسری تمام باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف کیوں نہ ہوں، ان کی آئیڈیالوجی (ایمان) مشترک ہے۔ اس لئے اس بنیادی وجۂ اشتراک کی بناء پر وہ ایک قوم کے افراد ہیں۔ اس دعوے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا آزاد (مرحوم) کہتے ہیں کہ

> یہ کہنا کہ جغرافیائی حدود، معیشت، زبان، ثقافت کے اختلاف کے باوجود، ان خطوں کے مسلمان محض مذہب کی بنیادوں پر ایک (قوم) بن سکتے ہیں، بہت بڑا فریب ہے۔ جس میں ان لوگوں کو مبتلا رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے ایک ایسی امت کی تشکیل کی کوشش کی تھی جو نسل، زبان، معیشت اور سیاست کی حدود و قیود سے بلند ہو کر محض بربنائے مذہب ایک معاشرہ بن جائے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس کی تشکیل کردہ سوسائٹی زیادہ سے زیادہ ایک سو سال تک قائم رہ سکی۔ اس کے بعد اسلام اپنی اس کوشش میں ناکام ہو گیا کہ وہ محض دین کی بنیادوں پر مختلف ملکوں کے مسلمانوں کو ایک مملکت میں جمع کر سکے۔ (صفحہ ۲۲۷)۔

لہٰذا اس ناکام تجربہ کو دہرانا حماقت ہے اور لوگوں کو اس کی دعوت دینا، فریب دہی۔ یہ تھی اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوسی، جس کی طرف حضرت علامہ نے اشارہ کیا ہے۔ اور یہی مایوس شدہ حضرات تھے جن کے متعلق کہا ہے کہ وہ اپنے قافلہ کے قافلہ سالار نہیں تھے۔ اس کے رہزن تھے۔ اس سے بڑی رہزنی اور کیا ہو سکتی ہے کہ کارواں کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے کے بجائے تباہیوں کے جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ قرآن کے الفاظ ہیں۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ۔ کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر کبھی غور کیا جنہوں نے

خدا کی نعمتوں کی ناقدرشناسی کی۔ اور اپنی قوم کے کاروان کو اس منڈی میں جا اتارا جہاں اس جنس کا کوئی خریدار نہ ہو۔ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا۔ یعنی انہیں تباہیوں کے جہنم میں دھکیل دیا۔ وَبِئْسَ الْقَرَارُ (۱۴/۲۹) کتنا بُرا ہے وہ ٹھکانہ جسے انہوں نے اپنے قافلہ کے لئے تجویز کیا ہے۔

اس قوم کی حالت یہ ہے کہ

از سہ قرن ایں امت خوار و زبوں　　　　زندہ بے سوز و سرور اندروں

تین سو سال سے اس قوم کی حالت یہ ہے کہ اس کا دل ایمان کے سوز و گداز سے خالی ہو چکا ہے اور یہ دنیا میں ذلیل و خوار زندگی بسر کر رہی ہے ــــ حضرت علامہؒ کے خیال کے مطابق ہندوستان میں آخری مرد مومن حضرت مجدد سرہندی (علیہ الرحمۃ) تھے۔ اس کے بعد یہاں کوئی بلند مرتبت مرد مسلمان پیدا نہیں ہوا۔ اسی مدت کو وہ سہ قرن (تین صدیوں) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ امام سرہندی (علیہ الرحمۃ) کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور اس زمانے میں ان کی ہستی مغتنمات میں سے تھی لیکن ایسا مرد مومن جو روح حرمیؐ کو سینے میں لئے آگے بڑھتا اور ملت اسلامیہ میں وہ داخلی اور خارجی انقلاب برپا کر دیتا جس کا نظارہ آسمان کی آنکھ نے عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں دیکھا تھا۔ اس دور کے بعد پھر پیدا ہی نہیں ہوا۔ بہرحال قوم پہ کتنی صدیاں بھی کیوں نہ گزری ہوں اس کی حالت یہ ہے کہ

پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق　　　　مکتب و ملائے او محروم شوق

نہ اس کے فکر میں بلندی ہے نہ سیرت میں پختگی۔ نہ نگاہ میں ظرفگی ہے نہ ذوق میں لطافت اور شگفتگی۔ قوموں کو یہ چیزیں صحیح تعلیم سے حاصل ہوا کرتی ہیں لیکن اس کی مذہبی درسگاہیں اور ان کے معلم۔ ملا۔ شوق سے محروم اور ذوق سے ناآشنا ہیں۔

زشتیٔ اندیشہ او را خوار کرد　　　　افتراق او را ز خود بیزار کرد

اس کی عقل و بصیرت کی بدنہادی نے اسے ذلیل و خوار کر رکھا ہے۔ پھر باہمی افتراق اور اختلاف سے اس کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ وہ اپنے آپ سے بیزار ہے۔

تا نداند از مقام و منزلش　　　　مُرد ذوق انقلاب اندر دلش

قرآن نے امت مسلمہ کو نوع انسان کی بہترین قوم قرار دیا ہے۔ مومن کو ہر ایک پہ غالب کیا ہے۔ اسے اقوام عالم کی لیڈرشپ (امامت) کا حقدار بتایا ہے۔ یہ ہے مومن کا صحیح مقام۔ لیکن چونکہ ملا نہ اپنے مقام سے واقف ہے اور نہ ہی اس منزل سے جہاں اسے پہنچنا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں انقلاب پیدا کرنے کی تمام آرزوئیں مردہ ہو چکی ہیں۔

طبع او بے صحبت مرد خبیر　　　　خستہ و افسردہ و حق ناپذیر

چونکہ اسے کسی ایسے مرد مومن کی صحبت میسر نہیں آئی جو مومن کے مقام اور کاروان ملت کی منزل سے باخبر ہو۔ اس لئے اس کی زندگی بے حد خستہ و خراب گزر رہی ہے حتیٰ کہ اس میں حق کے قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔

بندۂ زر کردۂ مولا است او مفلس و قلاش و بے پروا ست او

اس کی حالت اس غلام کی سی ہے جس کا آقا اسے نالائق و ناہنجار قرار دے کر نکال دے۔ مسلمان راندۂ بارگاہِ خداوندی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ مفلس و قلاش ہے۔ اور اسے دین و دنیا کا کچھ ہوش ہی نہیں۔ لیکن طرفہ تماشا یہ کہ بجائے اس کے کہ یہ سمجھے کہ میری مفلسی اور قلاشی سے ثابت ہوتا ہے کہ میں مردودِ بارگاہ ہوں۔ اسے الٹا مقربِ بارگاہِ خداوندی ہونے کی علامت بتاتا ہے۔ کس قدر بڑا ہے یہ فریب جس میں یہ مبتلا ہے۔ اس کے مردود ہونے کی حالت یہ ہے کہ

نے بکفِ مالے کہ سلطانے برد نے بدل نورے کہ شیطانے برد

نہ اس کے پاس مال و دولت ہی ہے کہ اس کی وجہ سے دنیا کی سلطنتیں اسے کسی توجہ کا مستحق سمجھیں اور نہ ہی اس کے دل میں متاعِ ایمان ہے جسے غارت کرنے کے لئے شیطان ہی اسے درخورِ اعتنا سمجھے۔ یہ ایک ایسی جنس کاسد ہے جسے دنیا میں کوئی پوچھتا تک نہیں۔ یہ اس کی ذلت و خواری کی انتہا ہے۔

شیخ او از رومی و فرنگی مامرید گرچہ گوید از مقامِ بایزید

یہ تو ان کے عوام کی حالت ہے۔ ان میں سب سے بڑا، جو اپنے آپ کو بایزید بسطامیؒ کے مقام پر سمجھتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہے کہ

گفت دیں را رونق از محکومی است زندگانی از خودی محرومی است

وہ قوم کو انگریز کی محکومی کا سبق پڑھا رہا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تم ہمیشہ حکومت کے وفادار رہو۔ خواہ وہ حکومت کسی کی ہو — اور اس کے سایۂ عاطفت میں رہتے ہوئے غلامی کی زندگی میں امن و چین سے دن گزارو۔ چنانچہ اس کی حالت یہ رہی ہے کہ

دولتِ اغیار را رحمت شمرد
رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد!

انگریزوں کی حکومت و سلطنت کو خدا کی رحمت قرار دیتا رہا۔ ساری عمر انگریز حکام کی کوٹھیوں کا طواف کرتا رہا اور یہی کچھ کرتے مر گیا۔

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں اشارہ میرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی طرف ہے۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے کئی ایک دیگر مقامات میں بھی بیان کیا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر مسلمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد می شناسی عصرِ ما، با ما چہ کرد

اے وہ کہ تیرا سینہ، زندہ آرزوؤں اور تابندہ تمناؤں کا مدفن بن چکا ہے (ذوق و شوق کی لذت سے محروم اور درد و سوز کی کیفیت سے نا آشنا ہو چکا ہے۔ تجھے کچھ معلوم بھی ہے کہ عصرِ حاضر نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے؟

عصر ما ما را ز ما بیگانہ کرد　　　از جمال مصطفیٰؐ بیگانہ کرد

عصر حاضر نے ہمیں خود اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا ہے۔ ہم پہچانتے ہی نہیں۔ کہ ہم کون ہیں۔ ہمارا مقام کیا ہے۔ ہم کاسۂ گدائی لے کر اقوام مغرب کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ ہم زندگی کے تصورات ان سے مستعار لیتے ہیں۔ ہمیں ان کی ہر ادا میں ہزار رعنائی نظر آتی ہے۔ ہم ان کی اندھی تقلید کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ عصر حاضر نے ہمارے ساتھ اتنا ہی نہیں کیا۔ وہ یہاں تک آگے بڑھ گیا کہ ہمیں اس راستے سے بھی بیگانہ کر دیا جس پر حضور نبی اکرمؐ کے درخشندہ نقوش قدم تابندہ ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں اور ہر اس راہ رو کے لئے مشعل راہ بنتے ہیں جو شرف انسانیت کی منزل تک پہنچنے کا ذوق اپنے دل میں رکھتا ہو۔ ہماری یہ محرومی سب سے بڑی محرومی ہے۔ یاد رکھئے۔

سوز او تا از میان سینہ رفت　　　جوہر آئینہ از آئینہ رفت

جب ہمارے دلوں سے ایمان کی وہ حرارت جاتی رہی جو حضورؐ کی سیرت طیبہ کو بطور اسوۂ حسنہ اپنے سامنے رکھنے سے پیدا ہو سکتی ہے تو ہمارے دل کا آئینہ، آئینہ نہ رہا۔ پتھر کا ٹکڑا بن گیا۔

باطن این عصر را نشناختی　　　داو اول خویش را در باختی

تو تہذیب مغرب کی ظاہری چمک دمک سے فریب کھا گیا۔ اور ان نگاہ فریب پردوں کو اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکا کہ تجھے نظر آجاتا کہ اس میں کس قدر تاریکیاں ہیں۔ یہ فریب اتنا بڑا تھا کہ تو نے اپنی ساری متاع حیات پہلے ہی داؤ میں ہار دی۔

تا دماغ تو بہ پیچاکش فتاد　　　آرزوئے زندہ در دل نزاد

جب تیری فکر تعلیم مغرب کے پھندے میں پھنس گئی تو تیرے دل میں کوئی زندہ آرزو پیدا نہ ہوئی۔

احتساب خویش کن از خود مرو　　　یک دو دم از غیر خود بیگانہ شو

اپنی ہستی کو پہچان۔ اپنا محاسبہ کر۔ تھوڑے سے وقت کے لئے مغرب سے مستعار لئے ہوئے افکار و تخیلات کو جھٹک کر الگ کر دے۔ اور یوں خالی الذہن ہو کر سوچ کہ تو کیا تھا اور کیا بن گیا۔

افرنگ از خود بے خبرت کرد وگرنہ　　　اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

اپنی ہستی سے بیگانہ ہو جانے کا نتیجہ ہے کہ تجھے اپنے آپ پر اعتماد اور بھروسہ ہی نہیں رہا۔

تا کجا این خوف و وسواس و ہراس　　　اندریں کشور مقام خود شناس

تیرا دل خوف اور ہراس کا مسکن اور شکوک و وساوس کا مامن بن رہا ہے۔

یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

اس یقین کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تو کائنات میں اپنے مقام سے آشنا ہو جائے گا۔

ایں چمن دارد بسے شاخِ بلند بر نگوں شاخے آشیاں خود مبند

چمن کائنات میں بڑے بڑے تناور اور بلند درخت ہیں تو انہیں چھوڑ کر اپنا آشیانہ ان شاخوں پر کیوں بناتا ہے جو جھک کر زمین کے ساتھ لگ رہی ہیں۔ تیرا مقام تو بہت بلند ہے۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اس لئے تو نے اپنے آپ کو اس قدر پستی پر کیوں رکھ چھوڑا ہے کہ جس کا جی چاہے جھپٹا مار کر تجھے شکار کر لے۔

نغمہ داری در گلو اے بے خبر جنسِ خود بشناس و با زاغاں مپر

تیرے گلے میں بلبل کا سا نغمہ اور کوئل کی سی موسیقی ہے۔ لیکن تو نے اپنے آپ کو کوا سمجھ رکھا ہے۔ تو اپنے مقام کو پہچان اور کوؤں سے الگ ہو جا۔

خویشتن را تیزیٔ شمشیر دہ باز خود را در کفِ تقدیر دہ

تجھے علم ہی نہیں کہ

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے

تو اپنے اندر تلوار کی سی سختی اور تیزی پیدا کر۔ اور اس کے بعد اس تلوار کو تقدیرِ خداوندی کے ہاتھ میں دے دے کہ وہ اس سے باطل کی رگِ جاں کو کاٹ کر الگ کر دے۔ "مومن خدا کے ہاتھ میں شمشیر کی مانند ہے" یہی قرآن کی تعلیم ہے۔ خدا کا ہر پروگرام جسے وہ انسانی دنیا میں کارفرما کرنا چاہتا ہے، اس کی تکمیل انسانی ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ مومن کا یہی مقام ہے اور یہی مصرف ہے۔

اندرونِ تست سیلِ بے پناہ پیشِ او کوہِ گراں مانندِ کاہ

تو اپنی پوشیدہ قوتوں سے واقف نہیں۔ تیرے اندر قوتوں کا طوفانِ بے پناہ پوشیدہ ہے۔ ایسا طوفان جس کے سامنے پہاڑ کی حیثیت ایک پرِ کاہ جیسی ہے۔

سیل را تمکیں ز نا آسودن است یک نفس آسودنش نابودن است

طوفان اس وقت تک طوفان ہے جب تک وہ متحرک اور متلاطم ہے۔ اگر وہ ایک ثانیہ کے لئے بھی تحرک سے ساکن ہو جائے تو وہ طوفان نہیں رہتا۔

من نہ مُلّا نے فقیہِ نکتہ ور نے مرا از فقر و درویشی خبر
در رہِ دیں تیز بین و سست گام پختۂ من خام و کارم ناتمام

میں نہ ملا ہوں نہ فقیہ۔ نہ مجھے فقر و درویشی کی کچھ خبر ہے۔ جہاں تک دین کا تعلق ہے اس میں بھی یہ کیفیت ہے کہ

نگاہ تو بے شک بہت تیز رکھتا ہوں لیکن عمل کی قوت بہت کم پائی جاتی ہے۔ میری جس فکر کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ بہت پختہ ہے وہ درحقیقت ہنوز خام ہے۔ میرے جس کلام کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ مکمل ہو گیا وہ ناتمام ہے اور یہ میری حالت ہے لیکن

تا دلِ پر اضطرابم دادہ اند یک گرہ از صد گرہ بکشادہ اند

اتنی بات ضرور ہے کہ میرے سینے میں ایسا دل ہے جو ملت کے درد سے لبریز ہے۔ وہ ہر وقت مضطرب و بیتاب رہتا ہے اور میری فکر کی سو گرہوں میں سے ایک گرہ کھل چکی ہے۔ بس یہ ہے میری متاعِ قلب و دماغ۔

از تب و تابم نصیب خود بگیر

بعد ازیں ناید چو من مرد فقیر

تم میری اسی تپش و خلش سے کچھ حصہ لے لو۔ اس دور میں اتنا بھی غنیمت سمجھو، اس لئے کہ میرے بعد مجھ جیسا مرد فقیر بھی نہیں آئے گا۔

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

جب تک مرض کی تشخیص نہ ہو اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔
ایک نامور حکیم دیدہ ور نے مدت العمر کی تحقیق کے بعد معلوم کیا کہ

اسبابِ زوالِ امت
کیا ھیں

اس کتاب نے لوگوں کے دل و دماغ میں انقلاب پیدا کر دیا اس کے متعدد ایڈیشن پہلے شائع ہوئے اب جدید ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی کے بعد سستے ایڈیشن کے طور پر شائع ہو گیا ہے۔ اس کے ہزاروں کی تعداد میں آرڈر پہلے سے بک ہو چکے ہیں آپ بھی اپنی فرمائش بھیج دیں تاکہ مزید انتظار نہ کرنا پڑے ——— قیمت ایک روپیہ

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۲ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

رجال اللہ

[ماہنامہ دارالفرقان لاہور کی جنوری سنہ ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں محترم عبد اللہ الاثری کے نام سے حسب ذیل مضمون (عنوانِ بالا کے تحت) شائع ہوا ہے۔ اسے پڑھئے اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ جائیے اور سوچئے کہ یہ کس اسلام کی باتیں ہیں ؟ اس میں نہ ماہنامہ مذکور کا کوئی قصور ہے نہ صاحبِ مضمون کا۔ یہ تصوف کی تعلیم ہے جسے عین دین نہیں بلکہ "مغزِ دین" سمجھا جاتا ہے ——— طلوعِ اسلام]

قرآن مجید میں رجال اللہ کا ذکر کئی جگہوں پر آیا ہے اور اس سے وہ بندگانِ خدا مراد لئے گئے ہیں جن کی زندگی اور موت ہمیشہ خدا تعالیٰ کے لئے وقف رہتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے :-

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۝ (النور ع ۵)

(وہ مردانِ (خدا) جنہیں تجارت اور (خرید و) فروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔)

صوفیائے کرام کے نزدیک اس آیۂ کریمہ میں اولیاء اللہ کی طرف اشارہ مقصود ہے اور اس نظریہ کے مطابق انہوں نے رجال اللہ کے لئے جن مراتب و مدارج کی تقسیم کی ہے ذیل میں ان کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

رجال اللہ کا وجود حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک اور آنحضرت صلعم سے لے کر ظہورِ مہدی علیہ السلام اور نزولِ عیسٰی علیہ السلام تک رہا اور رہیگا۔ قیامِ کائنات کا دارومدار ان پر ہے جو بندہ اور رب کے درمیان فیض رسانی کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔ امورِ تکوینیہ کے انصرام اور تصرفات کونیہ کی قدرت سے حق تعالیٰ ان کو مشرف فرماتا ہے۔ ان کی برکات سے نزولِ باران اور شادابیٔ نباتات، بقائے انواعِ حیوانات، آبادیٔ شہر و قصبات، انقلابِ احوال و تحوّلِ اقبال و ادبارِ سلاطین اور انقلابِ حالات، اغنیاء و مساکین، ترقی و تنزلِ اکابر و اصاغر اور رفعِ بلا و دفعِ وبا وغیرہ امور ظہور پذیر ہوتے ہیں جس طرح حق تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اس کی مقتضی ہے کہ آفتاب کو نور عطا فرمائے اور اس آفتاب سے عالم کو روشن کرے۔ اسی طرح حق تعالیٰ غیب الغیب سے ان حضرات پر ایک نور نازل فرماتا ہے اور پھر اس نور کو اصلاحِ عالم اور

نظام بنی آدم کا وسیلہ بنتا ہے۔

حضرات اولیاء دو اقسام پر منقسم ہیں۔

(۱) اولیائے ظاہرین۔

(۲) اولیائے مستورین۔

اولیائے ظاہرین کے سپرد ہدایت خلق کی خدمت ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ ہدایت کی خدمت ان کو اظہار پر مجبور کرتی ہے۔

اولیائے مستورین کے سپرد امور تکوینی کا انصرام ہوتا ہے اور یہ اغیار کی نگاہوں سے مستور ہوتے ہیں۔ یہ صاحب خدمت ہوتے ہیں اور امور انتظامی کے انصرام کے لئے ضرورت اظہار سے مستغنی ہیں۔ انہیں رجال الغیب اور مردان غیب کہا جاتا ہے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے قدم بہ قدم چل کر عالم شہادت سے اس غیب کی جانب منتقل ہو گئے ہیں جسے مستوی الرحمٰن کہتے ہیں۔ وہ نہ پہچانے جاتے ہیں اور نہ ان کا وصف بیان کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ وہ انسان ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو صرف اپنے ہی ٹھکانوں میں پائے جاتے ہیں۔ عالم ارواح میں جس انسان کی صورت چاہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ لوگوں کو مغیبات کی خبر دیتے ہیں اور پوشیدہ امور ظاہر کرتے ہیں۔ ان سے باتیں کرتے ہیں اور لوگوں پر ظاہر ہوتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کو جواب دیتے ہیں۔ جنگل، پہاڑ اور نہروں کے کنارے بستے ہیں۔ لیکن ان میں سے جو قوی تر ہیں وہ شہروں میں بستے ہیں۔ صفات بشری کو اپنے اوپر اوڑھے لپیٹے رکھتے ہیں۔ اچھے اچھے مکانوں میں رہتے ہیں۔ بیاہ شادی کرتے ہیں۔ کھاتے ہیں پیتے ہیں بیمار پڑتے ہیں اور علاج کرتے ہیں اولاد و اسباب اور اموال واملاک رکھتے ہیں۔ لوگ ان سے حسد بھی کرتے ہیں۔ دشمنی بھی برتتے ہیں۔ انہیں ایذا بھی پہنچاتے ہیں مگر حق تعالیٰ ان کے حسن احوال اور کمالات باطنی کو اغیار کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتا ہے۔

رجال اللہ ظاہرین ہوں یا مستورین بارہ اقسام میں منقسم ہیں:-

۱۔ اقطاب ۲۔ غوث ۳۔ امامان ۴۔ اوتاد ۵۔ ابدال ۶۔ اخیار ۷۔ ابرار ۸۔ نقباء ۹۔ نجباء ۱۰۔ عمد ۱۱۔ مکتوبان ۱۲۔ مفردان ؛

۱۔ اقطاب

ہر زمانے میں تمام دنیا میں سب سے بڑا قطب ایک ہوتا ہے جسے قطب عالم یا قطب کبریٰ یا قطب ارشاد یا قطب مدار یا قطب الاقطاب یا قطب جہاں یا جہاں گیر عالم کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ اس کا عالم سفلی و علوی میں تصرف ہوتا ہے۔ اور سارا عالم اسی کے فیض برکت سے قائم رہتا ہے اگر قطب عالم کا وجود درمیان سے ہٹا دیا جائے تو سارا عالم درہم برہم ہو جائے۔ قطب عالم حق تعالےٰ سے براہ راست اور بلاواسطہ فیض حاصل کرتا ہے اور اس فیض کو اپنے ماتحت اقطاب میں

تقسیم کرتا ہے۔ کسی بڑے شہر میں سکونت رکھتا ہے۔ بڑی عمر پاتا ہے۔ نورِ مصطفوی کی برکت سے ہر سمت میں دیکھتا ہے خواہ اس کی آنکھیں کھلی ہوں یا بند۔ ماتحت اقطاب کے تقرر، وتنزل اور ترقی کا اختیار رکھتا ہے۔ ولی کو معزول ومنتخب کرنے کا مجاز ہے۔ اور خود ولایت شمسی رکھتا ہے۔ برعکس قطب ابدال کے جس کی ولایت قمری ہوتی ہے۔ قطب عالم اسم رحمٰن کی تجلی کا مظہر ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم الوہیت کی تجلئ خاص کے مظہر ہیں۔ قطب عالم سالک ہوتا ہے اور اس کی ترقی جاری رہتی ہے۔ ترقی کرتے کرتے وہ مقام فردانیت تک پہنچ جاتا ہے جسے محبوبیت بھی کہتے ہیں۔ تمام رجال اللہ کے باطن میں اور نام ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ قطب عالم کا نام عبداللہ ہوتا ہے۔

اقطاب کے بھی بہت سے اقسام ہیں اور وہ سب قطب عالم کے ماتحت ہوتے ہیں۔ مثلاً قطب ابدال، قطب اقالیم۔ قطب ولایت وغیرہ۔ ہر نوع کا ایک جدا قطب ہوتا ہے۔ مثلاً قطب زہاد۔ قطب عباد، قطب عرفاء، قطب متوکلاں ـــــ ہر مقام، ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر گاؤں کا ایک قطب ہوتا ہے جو اس کی محافظت کرتا ہے۔ وہ بستی مومنوں سے آباد ہو یا کافروں سے، اس میں قطب کا ہونا لازمی ہے۔ مومنوں کی پرورش اسم ہادی کی تجلی کے تحت میں ہوتی ہے۔ اور کافروں کی پرورش اسم مُضِلّ کے تحت میں اور یہ دونوں اسماء اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔

۲۔ غوث

بعض لوگوں کے نزدیک قطب اور غوث ایک ہی چیز ہیں لیکن حضرت محی الدین ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ کے قول کے مطابق قطب الاقطاب اور غوث جدا جدا ہیں۔ بعض کے نزدیک قطبیت اور غوثیت دو جداگانہ منصب ہیں جو ایک ہی شخص میں مجتمع ہو سکتے ہیں۔ قطبیت کے اعتبار سے اسے قطب الاقطاب اور غوثیت کے اعتبار سے غوث کہتے ہیں۔

۳۔ امامان

قطب الاقطاب کے دو وزیر ہوتے ہیں جن کو امامان کہا جاتا ہے۔ ایک اس کے داہنے ہاتھ پر ہوتا ہے جس کا نام عبدالملک ہے اور دوسرا بائیں ہاتھ پر ہوتا ہے جس کا نام عبدالرب ہے۔ دائیں ہاتھ والا قطب مدار سے فیض حاصل کرتا ہے اور عالم علوی پر اس کا افاضہ کرتا ہے۔ بائیں ہاتھ والا قطب مدار سے فیض حاصل کر کے عالم سفلی پر افاضہ کرتا ہے لیکن بائیں ہاتھ والے کا مرتبہ دائیں ہاتھ والے کے مرتبہ سے بلند تر ہے۔ جب قطب الاقطاب کی جگہ خالی ہوتی ہے تو بائیں ہاتھ والے کو ملتی ہے اور دائیں ہاتھ والا بائیں ہاتھ والے کی جگہ پر آجاتا ہے۔ عالم کون وفساد میں انتظام رکھنا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت عالم علوی کے۔ اس لئے بائیں ہاتھ کا وزیر زیادہ قوی اور تجربہ کار رکھا جاتا ہے۔

۴۔ اوتاد

اوتاد چار ہوتے ہیں اور عالم کے چاروں کھونٹ پر ان میں سے ایک ایک متعین ہوتا ہے۔

ایک مغرب میں ہوتا ہے جس کا نام عبدالودود ہوتا ہے۔

دوسرا مشرق میں ہوتا ہے اور اس کا نام عبدالرحمٰن ہے۔

تیسرا جنوب میں ہے جس کا نام عبدالرحیم ہے۔

چوتھا شمال میں ہوتا ہے اور اس کا نام عبدالقدوس ہے۔

قیام عالم میں ان سے میخوں کا کام لیا جاتا ہے اور یہ بمنزلہ پہاڑ کے ہوتے ہیں جن سے زمین کی سرسبزی بھی مقصود ہے۔ قیام بھی اور سکون بھی۔ جیساکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا (النبا - ع ۱) "کیا نہیں کیا ہم نے زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں۔"

۵- ابدال

انہیں بدلا بھی کہتے ہیں۔ یہ سات ہوتے ہیں۔ اور سات اقالیم پر متعین ہوتے ہیں۔ ان کا مشرب سات انبیا علیہم السلام کے مشرب پر ہوتا ہے۔ ان کا کام مدد معنوی اور عاجزوں کی فریاد رسی ہے یہ سات ابدال اور ان کے مشرب کے سات انبیا حسب ذیل ہیں:

۱- ابدال اقلیم اول	بر قلب حضرت ابراہیم علیہ السلام		نام	عبدالحیٔ
۲- " دوم	" " موسیٰ "		نام	عبدالعلیم
۳- سوم	" " ہارون "		نام	عبدالمرید
۴- چہارم	" " ادریس "		نام	عبدالقادر
۵- پنجم	" " یوسف "		نام	عبدالقاہر
۶- ششم	" " عیسیٰ "		نام	عبدالسمیع
۷- ہفتم	" " آدم "		نام	عبدالبصیر

ان سات ابدالوں میں سے عبدالقادر اور عبدالقاہر وہ ہیں جنہیں اس ملک یا اس قوم پر مسلط کیا جاتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ قہر نازل فرماتا ہے۔ اور یہی ذریعہ مقہوری بنتے ہیں۔ ان سات ابدالوں کو قطب اقلیم بھی کہا جاتا ہے۔

متذکرہ بالا ابدالوں کے علاوہ پانچ ابدال اور بھی ہوتے ہیں جو یمن میں رہتے ہیں اور جنہیں قطب ولایت کہتے ہیں۔

قطب عالم کا فیض قطب اقالیم پر اور قطب اقالیم کا فیض قطب ولایت پر اور قطب ولایت کا فیض جملہ اولیا پر وارد ہوتا ہے

علاوہ ازیں ۳۵۰ ابدال اور بھی ہوتے ہیں جن میں سے تین سو قلب آدم علیہ السلام پر ہیں۔ میر سید محمد جعفر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ابدال ۳۵۰ نہیں بلکہ ۳۴۰ ہیں جو مختلف انبیا علیہم السلام کے مشرب پر ہوتے ہیں۔ اور مختلف خدمات جن کی تفویض میں رہتی ہیں۔

۶- اخیار

مذکورہ صدر ابدالوں میں سے سات ابدال ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں انہی کو اخیار کہتے ہیں اور ان سب کا نام حسین ہے

۷- ابرار

ان ہی ابدالوں میں سے چالیس ابدال وہ ہیں جو ابرار کہلاتے ہیں۔

۸- نقباء

ان سب کی تعداد تین سو ہے اور نام ان سب کا علی ہے۔

۹- نجباء

نجباء کی کل تعداد ۷۰ ہے۔ یہ مصر میں رہتے ہیں اور سب کا نام حسن ہے۔

۱۰- عمد

ان کی تعداد صرف چار ہے۔ ان کا نام محمد ہے اور یہ دنیا کے زاویوں میں رہتے ہیں۔

۱۱- مکتومان

یہ لوگ چار ہزار ہوتے ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں لیکن اپنے آپ کو نہیں پہچانتے۔ یہ ایسے لباس میں ہوتے ہیں کہ اغیار نہیں پہچان سکتے۔

۱۲- مفردان

افراد کو کہتے ہیں۔ جب قطب عالم ترقی کرتا ہے تو فرد ہو جاتا ہے۔ فردانیت میں پہنچ کر وہ تصرفات سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ قطب مدار عرش سے ثریٰ تک متصرف ہوتا ہے اور فرد متحقق ہوتا ہے۔ تصرف اور تحقق میں بڑا فرق ہے۔ قطب دائماً علی الدوام تجلی صفات میں رہتا ہے۔ لیکن فرد تجلی ذات میں ہوتا ہے۔ قطب مدار خاص ہے اور فرد اخص۔ فردانیت مقام انبساط و موانست ہے اور یہاں آکر مراد باقی نہیں رہتی۔ بعض اولیاء کو تجلی افعالی ہوتی ہے۔ بعض کو تجلی اسمائی اور بعض کو تجلی آثاری۔ بعض مقام صحو میں ہوتے ہیں۔ بعض مقام سکر میں اور بعض دونوں میں۔ غرضیکہ اولیاء اللہ کے مقامات حد و حصر سے خارج ہیں۔ مگر اہل فردانیت ان جملہ مقامات سے برتر ہیں۔ تنزل کی تو ایک حد ہوتی ہے مگر عروج و ارتقاء کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ افراد جب مزید ترقی کر کے فردانیت میں کامل ہو جاتے ہیں تو محبوبیت کا مرتبہ پاتے ہیں۔ پھر محبوبیت میں بھی بعض مقبولان بارگاہ الٰہی ایک خاص شان امتیازی سے نوازے جاتے ہیں۔ جیسے حضرت غوث الثقلین سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ اور سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ۔ چنانچہ صاحب بحر المعانی لکھتے ہیں۔

"روزے ایں فقیر در کشتی دریائے نیل مصر با حضرت خضر علیہ السلام
مصاحب بود۔ سخن در میان شاہدان لایزالی می رفت خضر علیہ السلام
می فرمود کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی و حضرت شیخ نظام الدین
بدایونی در مقام معشوقی بودند و امثال ایشاں دیگرے نہ رسیدہ"

یعنی ایک دن یہ فقیر مصر کے دریائے نیل پر ایک کشتی میں حضرت خضر علیہ السلام کے ہمراہ سوار تھا۔ خدا تعالیٰ کے محبوبوں کی بات درمیان میں آئی تو حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور حضرت نظام الدین اولیاء بدایونی معشوقی کے مقام میں تھے اور ان کی مثال تک دوسرا نہیں پہنچا۔

طلوعِ اسلام

ملاحظہ فرمالیا آپ نے، یہی ہیں وہ مقامات جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (۵۳/۲۳) ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ چند نام ہیں، جو تم نے یا تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے ہیں۔ خدا نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔

صاحبِ مضمون نے فرمایا ہے کہ تنزل کی تو ایک حد ہوتی ہے مگر عروج و ارتقاء کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جہاں تک اسلام کے مسخ کے جانے کا تعلق ہے، یہ حقیقت ہے کہ

عروج و ارتقاء کی تو کوئی حد ہوتی ہے لیکن تنزل کی کوئی حد و انتہا نہیں۔

"رجال اللہ" کے جو مناصب و مدارج اور اسماء و صفات بیان کی گئی ہیں، کیا صحابہ کبارؓ کے زمانے میں ان میں سے کسی ایک کا ذکر بھی آپ کو کہیں ملتا ہے۔ سچ کہا تھا علامہ اقبال نے کہ

تصوف اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے۔

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) کی علمی اور تاریخی کاوشوں کا شاہکار

فجر الاسلام

جسے مولانا عمر احمد عثمانی نے اردو زبان میں منتقل کیا۔

اس دور کی علمی حرکات اور تہذیبی کیفیات کا تفصیلی جائزہ جب آفتابِ اسلام کی جلوہ باریوں نے بزمِ انسانی کو منور کیا۔

ضخامت ۹۰۰ صفحات —— قیمت آٹھ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ —— ۲۷ بی —— شاہ عالم مارکیٹ لاہور

محترم شاہد حسین رزاقی صاحب

اصلاحِ عقائد کیلئے سرسیّد کی کوششیں

سرسید کے زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ صدیوں کے دوران میں وہ رفتہ رفتہ صحیح اسلامی تعلیمات اور اس کے اصول و مقاصد سے دور ہو گئے تھے۔ اور غیر محسوس طریقہ پر اس ملک کی غیر مسلم قوموں کے بہت سے عقائد و نظریات، رسوم و رواج اور توہمات اختیار کر لئے تھے۔ جو درحقیقت اسلامی تعلیمات کے خلاف تھے۔ مسلمانوں کے اس غلط طرزِ عمل اور ملک کے بدلے ہوئے حالات نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے لئے شدید خطرات اور اہم مسائل پیدا کر دئے تھے۔ اور اسلام کے فروغ و استحکام اور مسلمانوں کی بقا و ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے ان کے عقائد و نظریات کو درست کرنا بھی نہایت ضروری تھا۔ سرسید نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اپنی اصلاحی تحریک میں دینی عقائد کی درستی کو بنیادی اہمیت دی۔ سرسید کو اس بات کا رنج تھا کہ مسلمان غیر اسلامی چیزوں کو اسلامی تصور کر کے ان پر عمل کرتے ہیں جس کی وجہ سے ایک طرف تو ان کی دینی و معاشرتی حالت بگڑ گئی ہے اور دوسری طرف اسلام کی بدنامی ہوتی ہے کیونکہ لوگ مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر اسلام کے متعلق غلط رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اور مسلمانوں کی زبونِ حالی کو اسلامی تعلیمات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس غلط خیال کو دور کرنے اور مسلمانوں کی دینی و معاشرتی حالت کو بہتر بنانے کے لئے سرسید نے مسلمانوں کے عقائد و نظریات درست کرنے کی ضرورت و اہمیت واضح کی۔ اور اس مقصد کے لئے موثر جد و جہد شروع کر دی۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان پر عیسائیوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور ان کے تبلیغی ادارے جن کو حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی، مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے اسلام پر طرح طرح کے الزام عائد کرتے تھے۔ لیکن مسلمان اپنے مذہب کی حقیقت سے ناواقف ہونے کی بنا پر ان کی موثر تردید نہ کر سکتے تھے اور عیسائی پروپیگنڈے سے ان کے گمراہ ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا۔ اسلام کے دشمنوں نے عیسائیوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اسلام انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن کا مخالف اور خون آشام مذہب ہے۔ اس لئے عیسائی مسلمانوں کو

بہت خطرناک تصور کرتے تھے اور چونکہ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے وہ ان کو اپنا شدید مخالف سمجھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم نے ان کے اس اندیشہ کو درست ثابت کر دیا تھا کہ اگر مسلمانوں کو موقع مل گیا تو وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس لئے انگریزوں کی پالیسی مسلمانوں اور اسلام کی مخالفت پر مبنی تھی اور انھوں نے جو طریقہ تعلیم نافذ کیا وہ مسلمانوں کے دینی عقائد میں شکوک، شبہات اور انتشار پیدا کرنے والا تھا۔ چونکہ مسلمان اسلام سے صحیح طور پر واقف نہ تھے اور نئے نظام تعلیم میں ان کی مذہبی تعلیم و تربیت کا انتظام نہ تھا۔ اس لئے نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اسلام سے بدگمانی پیدا ہو جانے کا قوی امکان تھا اور بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے لئے جدید انگریزی تعلیم حاصل کرنا بھی نہایت ضروری تھا۔ یہ وہ بڑے خطرات تھے جن پر غالب آنا ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کیلئے بہت ضروری تھا اور سرسید نے ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کے دینی عقائد کی اصلاح کے لئے اسلامی تعلیمات کو صحیح طور پر پیش کیا۔ عیسائیوں کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا۔ انگریزی حکومت کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی اور جدید انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم و تربیت دینے کے منصوبہ کو بڑی خوبی اور کامیابی سے عملی شکل دی۔

مذہب کی سچائی اور فضیلت کا معیار

عقائد و نظریات کو درست کرنے کے لئے سرسید نے یہ کوشش کی کہ اسلام کا صحیح تصور مسلمانوں کے ذہن میں بیٹھ جائے اور وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ محض عبادات اور رسوم و رواج کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کی صحیح رہنمائی کرنے والا دین ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد انسان کی پوری زندگی کو سنوارنا اور نکھارنا ہے۔ اسلام کے اس دعوے کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے تمام اصول فطرتِ انسانی کے مطابق ہیں اور اس کی کوئی تعلیم ایسی نہیں ہے جو انسان کے مرتبہ کے منافی ہو یا جس پر عمل کرنا اس کے امکانات سے باہر ہو۔ اسلام کے بارے میں سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ کوئی مذہب البادنیا میں نہیں ہے جو دوسرے مذہب پر گو وہ کیسا ہی باطل کیوں نہ ہو اپنی ترجیح بوجوہ ثابت کر سکے۔ مگر یہ رتبہ صرف اسی مذہب کو حاصل ہے جو نیچر کے مطابق ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ وہ صرف ایک مذہب ہے جس کو میں ٹھیٹھ اسلام کہتا ہوں اور جو بدعات محدثات سے اور غلط خیالِ اجماع سے اور خطائے اجتہادات سے اور ڈھکوسلہ قیاسات سے اور شکوک اصولِ فقہ

سلہ حاشیہ مضمون کے آخر میں دیکھئے۔ طلوع اسلام۔

"مخرج سے مراد پاک ہے۔" مذہب کی سچائی اور برتری کا معیار سر سید نے یہ قرار دیا کہ اس میں کوئی بات قانونِ فطرت کے برخلاف نہ ہو۔ کیونکہ قانونِ فطرت درحقیقت خدا کا فعل ہے اور جو مذہب واقعی خدا کا بھیجا ہوا ہوگا وہ خدا کا قول ہوگا۔ پس اس کے فعل اور اس کے قول میں مطابقت ہونا ضروری ہے۔ مذہب کو جانچنے کے اسی معیار کے مطابق انہوں نے اسلام کی سچائی اور فضیلت کو تسلیم کیا اور ۱۸۸۴ء میں لاہور میں اسلام پر تقریر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسلام فطری دین ہے اور اس کے اصول فطرت کے مطابق ہیں۔ منطق و فلسفہ اور علم طبیعی میں کتنی کچھ تبدیلی کیوں نہ ہو اور ان کے مسائل اسلام کے مخالف ہی کیوں نہ معلوم ہوں اسلام ہی برحق اور سچا ہے۔ اسلام فطرت انسانی کے مطابق ہے اور یہی اس کی سچائی کا ثبوت ہے۔ اسلام کے مسائل دو قسم کے ہیں منصوص اور اجتہادی۔ خدا اور خدا کی وحدانیت پر ایمان اور تصدیق نبوت اسلام کے دو بنیادی رکن ہیں۔ اور اسلامی احکام کا وہ حصہ جس کو تمام مسلمان ملہم من عنداللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخر الزمانؐ کے دل میں القا ہوا ہے اسی طرح بے کم و کاست نبیؐ سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے۔ اس کی پوری طرح تعمیل کرنا لازمی ہے۔ اور یہ حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اس میں جو بات مسائل فلسفہ و حکمت کے خلاف معلوم ہو اس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائل حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے لیکن اجتہادی مسائل صحیح بھی ہو سکتے ہیں۔ اور غلط بھی اور ان میں جو غلط ہوں ان کی اصلاح کرنے کا دروازہ کھلا ہوا ہے کیونکہ اجتہادی مسئلہ مجتہد کا خیال ہے جو خطا سے معصوم نہیں۔ چنانچہ اجتہادی مسائل اگر فطرت انسانی کے برخلاف ہوں تو اس سے اسلام پر حرف نہیں آتا اور اصل اسلام کی جو روشنی ہے اس میں کچھ نقص نہیں آتا۔

دین و دُنیا میں تفریق کا غلط رجحان

اسلام نے دین اور دنیا میں تفریق کرنے کے بجائے ان میں ہم آہنگی پیدا کی ہے اور دونوں کی بہتری کے طریقے بتلائے ہیں۔ لیکن اسلامی اثرات کے تحت مسلمانوں میں دین اور دنیا میں تفریق کرنے کا رجحان پیدا ہوگیا۔ سر سید کے عہد میں مسلمانوں کی اصلاح میں یہ خیال ایک بڑی رکاوٹ تھا کہ اصل چیز تو صرف نجات آخروی ہے۔ دُنیاوی نعمتیں حاصل کرنے کی خواہش بڑی گمراہی ہے۔ اس عقیدے نے مسلمانوں میں اس قدر غلط احساس پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنی تباہ حال زندگی کو سنوارنے اور ترقی کرنے کے خیال سے غافل ہوگئے تھے۔ اس رجحان کو ختم کر کے لوگوں کو اپنی حالت کو بہتر بنانے پر متوجہ کرنے کے لئے سر سید نے ان کو یہ بتلایا کہ نجات ابدی جو ہر سچے مذہب یا سچے دین کا نتیجہ ہے وہ دنیا کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں ہے۔ ایک ایسا شخص جس نے تمام عمر عسرت و تنگی میں بسر کی ہو سچے مذہب کی بدولت نجات ابدی حاصل کر سکتا ہے اور جس نے لاکھوں کروڑوں روپے جائز طور پر پیدا اور صرف کئے ہوں وہ بھی سچے مذہب کی بدولت نجات ابدی پا سکتا ہے

دُنیا اور دین میں ایسا مستحکم رشتہ ہے جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔ جس طرح بدبختی سے دنیا دین کو غارت کر دیتی ہے اسی طرح خوش بختی سے دنیا دین کو سنوار بھی دیتی ہے۔ فرض کرو کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے پاس دولت و حکومت اور منصب نہ رہے۔ سب مفلس اور نانِ شبینہ کو محتاج ہوں اور در بدر بھیک مانگتے پھریں۔ اور ان کی اولاد جاہل اور نالائق، چور اور بدمعاش ہو تو اس وقت ان کے دین کا کیا حال ہو گا۔ پیٹ ایک ایسی چیز ہے کہ دین بھی بیچا جاتا ہے۔ خدا سلے یاد نہ لے۔ اس کو بہر حال بھرنا ہے۔ پیٹ بھرنے کے لئے بڑے دیندار وں کی نسبت تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ کسی جنگل میں گھاس چھیل رہے ہیں۔ کسی پہاڑ پر لکڑیاں چن رہے ہیں یا کسی کا گھوڑا مل رہے ہیں۔ لیکن جو ایسے پکے دیندار نہیں ہیں وہ کیا کریں گے۔ معلوم نہیں کہ ان سے جیل خانے اور نو آبادِ جزائر بھریں گے یا یتیم خانے اور کلیسیا رونق پا دیں گے۔ پس ایسی حالت میں خیال کرنا چاہئے کہ دین اسلام کی کیا شان ہو گی۔ اگر مسلمانوں کی حالت اتنی خراب ہو جائے کہ واعظین کو جو محض ریاکاری اور مکاری سے دنیا کماتے پھرتے ہیں، کوئی ٹکا دینے والا یا حرام کا لقمہ تر کھلانے والا نہ رہے۔ جناب حضرت پیرجی صاحب جو لوگوں کو مرید کر کے اپنا لشکر بناتے پھرتے ہیں، اور سالانہ ٹیکس یا جزیہ ان پر مقرر کرتے ہیں ان کو کوئی دینے والا نہ رہے یا جناب مولوی صاحب قبلہ جو حدیث و تفسیر یا صدرا و شمس بازغہ پڑھاتے ہیں ان کو کوئی چار پیسے کا نوکر رکھنے والا نہ رہے۔ اس وقت ان سب کو یہ پتہ چلے گا کہ مسلمانوں میں دنیاوی ترقی و تہذیب اور تربیت و شائستگی میں کوشش کرنا اور امرِ معاش میں منہمک ہونا امرِ معاد سے غفلت برتنا ہے یا یہ کام خاص خدا کا اور بالکل دین کا اور سراسر معاد کا ہے۔

سرسید کا یہ خیال تھا کہ اگر مسلمانوں کی دنیاوی حالت اچھی ہو گی تو اس سے ان کے دین کی بھی عزت اور توقیر بڑھے گی۔ اور اگر وہ دُنیاوی اعتبار سے ذلیل و خوار ہوں گے تو ان کی اس حالت سے ان کے دین پر بھی برا اثر پڑے گا۔ چنانچہ ایسی حالت میں جب کہ مسلمان معاشی تباہی، معاشرتی بدحالی اور علم سے محرومی کے باعث روز بروز پستی سے پست تر ہوتے جا رہے تھے اور ذلیل و حقیر سمجھے جاتے تھے۔ اس بات کی کوشش کرنا کہ مسلمانوں میں قومی ترقی ہو، علوم دینی قائم رہیں، علوم دنیاوی قائم رہیں۔ علوم دنیاوی جو مفید مد کار آمد ہیں ان کا رواج اور ترقی ہو۔ لوگ معاش سے فارغ البال ہوں، اکل حلال پیدا کرنے کے وسیلے ہاتھ آویں۔ جن معاشرت میں جو نقص ہوں وہ رفع ہوں۔ جن بری رسموں اور خراب عادتوں سے غیر قوم میں مسلمانوں کو، اسلام کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہیں۔ وہ موقوف کی جاویں جو خلافِ شرع تعصبات و توہمات ہیں اور ہر طرح کی ترقی کے مانع ہیں وہ دور کئے جاویں۔ سرسید کے نزدیک محض دنیا پرستی نہ تھی بلکہ عین دینداری بھی تھی۔

عبادت کا مفہوم

عبادت کے متعلق مسلمانوں میں جو غلط تصور قائم ہو گیا تھا سرسید نے اس کی اصلاح کرنے کی بھی کوشش کی۔ لوگ اس

چیز کو بھول گئے تھے کہ ایک فطری دین اس چیز کو پسند نہیں کر سکتا کہ عبادت قانونِ فطرت کے خلاف ہو۔ اور انسان ان تقاضوں کو پورا نہ کرے جو فطرت نے اس پر عائد کئے ہیں۔ عبادت کے صحیح مفہوم سے ناواقف لوگوں کا خیال یہ تھا کہ تمام رات نماز پڑھنا ہمیشہ دن کو روزہ رکھنا یا کبھی شادی نہ کرنا قابلِ تعریف عبادت ہے۔ لیکن عبادت کا یہ ایسا تصور ہے جس کو خود حضور رسالت مآب نے غلط قرار دیا ہے۔ سرسید نے حضورؐ کے اس خیال کو مستند قرار دے کر مسلمانوں کو یہ بتلایا کہ اصلی اور سچی عبادت وہی ہے جو قانونِ قدرت کے اصول کے مطابق ہو اور تمام نیکیاں اور عبادتیں جو قانونِ قدرت کے برخلاف ہوتی ہیں پوری نیکیاں اور عبادتیں نہیں ہوتیں۔ تمام قوے جو خدا تعالیٰ نے انسان میں پیدا کئے ہیں وہ اس لئے پیدا نہیں کئے کہ وہ بیکار کر دیئے جائیں بلکہ اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ سب کام میں لائے جائیں۔ اسلام نے ان قوتوں کے کام میں لانے کا ایسا طریقہ بنایا ہے جس سے تمام قوئے اعتدال پر اور شگفتہ و شاداب رہیں۔ اور ایک کے غلبہ سے دوسرا بیکار اور پژمردہ نہ ہو جائے۔ مگر بہت ہی کم لوگ ہیں جو اس نکتہ کو سمجھتے ہیں اور اس طریقہ کو جس کو ہمارے پیغمبر خدا صلعم نے رہبانیت قرار دیا ہے اور جس کو ہندی زبان میں جو گ کہتے ہیں کمالِ عبادت اور انتہائے زہد و تقویٰ قرار دیتے ہیں۔ ہمارے زمانہ کے مسلمانوں نے سوائے نوافل کے باقی عبادتوں کو صرف نماز، روزہ، تلاوتِ قرآن مجید اور خیالی ترکِ دنیا اور درس و تدریس علوم دینیہ اور اوراد ماثورہ یا وظائف مقررۂ پیران ہی میں منحصر کر رکھا ہے حالانکہ انہیں پر ان کا انحصار محض غلط ہے۔ بلکہ ان میں سے بعض ایسے درجہ پر پہنچ گئے ہیں جو قانونِ قدرت کے برخلاف ہیں اور اس لئے مقصود شارع نہیں ہیں۔"

زہد و ریاضت

مسلمانوں کے عقائد کو درست کرنے کے لئے سرسید نے اس خیال کو غلط قرار دیا جو زہد و ریاضت کے بارے میں عام طور پر پایا جاتا تھا اور اس بات پر بہت زور دیا کہ جو نیک کام ذکر و اشغال سے زیادہ مفید ہیں وہ بھی عبادت کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کو مناسب اہمیت نہ دینا بڑی غلطی ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ واضح کیا کہ ایک بڑی غلطی جس میں مسلمان پڑے ہیں وہ یہ ہے کہ انہوں نے زہد و ریاضت کو صرف راتوں کو جاگنے اور ذکر و شغل کرنے اور نفل پڑھنے اور نفلی روزے رکھنے پر منحصر سمجھا ہے۔ زہد و ریاضت جہاں تک کہ حدِ شرعی سے تجاوز نہ کرے بلاشبہ نیکی و عبادت ہے۔ مگر عام فلاح پر کوشش کرنا اور ایسے امور پر کوشش کرنا جو اپنے ہم مذہبوں کے دینی اور دنیوی حال اور مآل کی بھلائی و بہتری کے ہوں اس سے بہت زیادہ مفید ہیں۔ زہد و ریاضت ایک بخیل نیکی ہے جو صرف اپنی ذات کے لئے کی جاتی ہے اور اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو ایک کوٹھڑی میں بیٹھ کر کھانا کھا لے اور صرف اپنا پیٹ بھر لے۔ لیکن عام فلاح چاہنے والا جو اس کام میں زہد و ریاضت کرتا ہے اس کی مثال حاتم کی سخاوت کی سی ہے جو ہزاروں آدمیوں کو کھلا کر کھاتا ہے۔ پس کیسی بڑی غلطی ہے کہ

تن پروری کو تو عبادت سمجھا جاوے اور اصلی فیاضی اور سخاوت اور ہمدردی کو عبادت نہ سمجھا جاوے۔

سرسید کے نزدیک حالات کے بدلنے سے عبادت اور ثواب کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ چنانچہ کسی مقام میں اگر پانی کا قحط ہو تو اس جگہ بیٹھ کر نفل پڑھنے یا قرآن مجید کی تلاوت کرنے یا ذکر و شغل کی ضرب لگانے سے زیادہ ثواب کا کام یہ ہے کہ کندھے پر مشک لاد کر لوگوں کو پانی پلایا جائے۔ اس لئے ایک ایسے زمانے میں جب کہ مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی ان کی فلاح و ترقی اور بہتری کے لئے کوشش کرنا نفلیں پڑھنے اور رات کو جاگ کر ریاضت کرنے سے زیادہ ثواب کا کام تھا۔

ترکِ دُنیا

مسلمانوں کے جو غلط رجحانات ان کے زوال کا باعث بنے اور معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لئے جن کو ختم کرنا سرسید نے ضروری سمجھا۔ ان میں ترکِ دنیا کو عبادت تصور کرنے کا غیر اسلامی عقیدہ بھی شامل تھا۔ اسلام اس کی اجازت تو ہرگز نہیں دیتا کہ انسان اپنے نفس کا بندہ اور دنیاوی لذتوں اور خواہشوں کا غلام بن جائے لیکن وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دنیاوی نعمتیں پیدا کی ہیں انسان ان سے مناسب طور پر فائدہ اٹھائے اور ان کو بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے استعمال کرے۔ لیکن مسلمان جب اپنے مذہب کی تعلیمات سے دور ہونے لگے تو انہوں نے راہبوں اور جوگیوں کا اثر قبول کر لیا اور ترکِ دنیا کو عبادت خیال کرنے لگے۔ ان کی یہ مفروضہ دینداری درحقیقت دین اور اس کے معاشرتی مقاصد کے خلاف تھی اور سرسید نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ یہ خیال کہ ترکِ دنیا عبادت ہے ایک ایسا غلط اور جھوٹا قول ہے کہ اس سے زیادہ دوسرا نہیں ہو سکتا۔ دنیا ہمارے لئے پیدا ہوئی ہے اور ہم دنیا کے لئے۔ پھر ہم اس کو اس طرح پر جس طرح کہ جھوٹے دنیا ترک کرنے والے ترک کرتے کو کہتے ہیں کیونکر ترک کر سکتے ہیں۔ ہاں جس طرح کہ شارع نے ترکِ دنیا کرنا بتایا ہے اس طرح پر ترک کرنا چاہیے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم دنیا کو اس طرح پر پکڑیں جس طرح کہ شارع نے بتایا ہے نہ کہ اپنے جذباتِ نفسانی کی مرضی پر اور اس کو اس طرح پر کام میں لاویں جس طرح قانونِ قدرت نے ہم کو سکھایا ہے نہ کہ اپنی ہوائے نفس کے مطابق۔ پس یہ بات سمجھنا کہ امورات دنیا میں معروف ہونا عبادت نہیں ہے عین غلطی ہے۔ اس کو قانونِ قدرت کے برخلاف استعمال میں لانا شقاوت اور اس کے مطابق برتنا و عمل میں لانا عین عبادت ہے۔

سرسید نے اس خدا پرست کو نادان قرار دیا ہے۔ جو صرف خدا کی محبت اور دنیا سے نفرت کا طلبگار رہے جس کو زہد و تقوی کے سوا اور کچھ کام نہ ہو اور دنیا کی طرف سے نہایت عاجز و ذلیل اور بے استطاعت و بے مقدور ہو اور جو نہ خود عزت سے رہ سکے اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکے۔ اور اس کے برعکس ایسے دنیادار کو بہت دانا سمجھتے ہیں جو نیک کاموں کے لئے دنیا اور اس کی نعمتوں کا طلب گار رہے۔ اور دنیا کی جاہ و حشمت سے مالا مال ہو کر قوم کی بھلائی اور ترقی کے اسباب مہیا کرے۔

کیونکہ کے نزدیک" طوطے کی طرح اللہ اللہ جپنا اور یا ہو کبوتر کی طرح غوٹرغوں غوٹرغوں کرنا اللہ کی یاد نہیں ہے بلکہ اس نے جو چیزیں مرحمت کی ہیں ان کو اسی کے کام میں صرف کرنا خدا کی یاد ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو تمام نعمتیں اس لئے عطا کی ہیں کہ ہم خود بھی ان سے فائدہ اٹھائیں اور اوروں کو بھی فائدہ پہنچائیں۔

جس زمانہ میں سر سید علی گڑھ میں مدرستہ العلوم قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دہلی کے نامور عالم اور معتبر قرآن مولانا عبدالحق دہلوی نے مدرسہ کے مقاصد پر کچھ اعتراضات کرکے دنیا اور اس کی تمام چیزوں کو ناپائیدار قرار دے کر یہ نصیحت کی کہ انسان ہر دم کو دم واپسیں جانے اور اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔ سر سید نے مدرسہ کے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور مولانا کی نصیحت کا یہ جواب دیا کہ بلاشبہ یہ عمدہ نصیحت ہے۔ مگر ایسی بات ہے کہ اس کو ہر کوئی ادنیٰ و اعلیٰ، عالم و جاہل سب جانتے ہیں مگر افسوس کہ کرتا کوئی نہیں۔ اگر آپ خود ہی اس پر عمل رکھتے ہوتے تو آخر میں یہ ارقام نہ فرماتے "محض منتظر الجواب" کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ آپ میرا جواب پہنچنے تک زندہ رہیں گے۔ اس وقت آپ کو اپنی نصیحت کا کہ ہر دم کو دم واپسیں جاننا چاہیئے کیوں خیال نہ رہا؟ میں نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے اپنے رہنے کی کبھی کوئی کچی یا پکی حویلی بھی بنوائی ہے؟ کبھی اپنے رہنے کے لئے چھپر ڈلوایا ہے؟ آپ کے پاس پہننے کے جوڑے ہیں؟ ان میں سے ایک تو آپ پہنے ہوئے ہوں گے۔ اور باقیوں کو آیندہ پہننے کے لئے رکھا ہوگا۔ کم سے کم نانبائی کو صبح و شام کی روٹی پکانے کا حکم دیتے ہوں گے اور اس ماہ مبارک رمضان میں سحری کے لئے بھی کچھ ضرور اشعار کہتے ہوں گے۔ مگر آپ کو اس نصیحت پر کبھی عمل کرنے کا اتفاق نہیں ہوتا کہ شاید یہی نفس نفس واپسیں ہو۔ پس جس بات پر کہ آپ کبھی عمل نہیں فرماتے دوسروں کو اس کے کرنے کی کیوں نصیحت فرماتے ہیں۔ جناب ایسی باتیں کہہ دینی اور لکھ دینی آسان ہیں مگر اس پر کسی کو عمل کرتے نہیں دیکھا۔

بندہ نے بھی زمانہ دیکھا ہے۔ بڑے بڑے مقدس عالموں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ بڑے بڑے بزرگوں اور درویشوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں مگر بجز بعض ﷺ کا سب کو محتاج پایا۔ پھر بھلا آپ ایسی باتیں جاہل مسلمانوں کے برباد کرنے کو کیوں فرماتے ہیں؟ ہمارے دین میں کچھ تنگی نہیں ہے جس سے خدا اور رسولؐ نے منع فرمایا ہے اس سے ہم کو پرہیز کرنا چاہیئے۔ اور جس چیز سے ہم کو منع نہیں کیا وہ ہمارے لئے حلال اور مباح اور خدا کی نعمت ہے۔ ہم کو شریعت محمدیہ کی مطابقت میں خدا کی نعمتوں کو لوٹنے دو۔ وہ تو ہمارے خدا کی نعمتیں ہیں اور اس نے ہمارے لئے بنائی ہیں۔ پھر ہم نہ لوٹیں گے تو کون لوٹے گا۔ ہاں خدا سے یہ دعا مانگو کہ ہم ان نعمتوں کے سبب سے مغرور نہ ہو جائیں اور اپنے خدا کو جس نے وہ نعمتیں ہمارے لئے وقف کر دی ہیں بھول نہ جائیں"۔ سر سید کے اس جواب سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ دنیا اور اس کی نعمتوں کو

ط دو پیسہ

ناپائیدار قرار دے کر ترک دنیا کی تعلیم دیتے ہیں وہ خود بھی اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ ان میں اتنی ہمت، طاقت اور صلاحیت نہیں ہوتی کہ اپنی تباہ حال قوم کو زوال و ادبار کی پستیوں سے نکال کر راہ ترقی پر گامزن کر سکیں اس لئے وہ دینداری کا سہارا لے کر ایسی باتیں کہتے ہیں جو دین کے خلاف ہوتی ہیں اور جس کا نتیجہ قوم کے حق میں مزید تباہیوں کی شکل میں نکلتا ہے۔

پاک اور ناپاک علوم

غلط اور گمراہ کن نظریات نے مسلمانوں میں جو نقصان رساں عقائد پیدا کر دیے اور جن کو دور کئے بغیر معاشرہ کی حالت کو بہتر بنانا ممکن نہیں ہے۔ ان میں یہ غلط خیال بھی شامل ہے کہ صرف دینی علوم کی تحصیل تو عبادت میں داخل ہے۔ لیکن دنیاوی علوم کو حاصل کرنا بے دینی اور گمراہی کا ثبوت ہے۔ علم دین فقہ، تفسیر اور حدیث تک محدود ہے اور جو شخص ان کے علاوہ کوئی اور علم حاصل کرتا ہے وہ خبیث بن جاتا ہے۔ علم کے متعلق یہ نظریہ سرسید نے غلط قرار دے کر یہ واضح کیا کہ اسی سبب سے مسلمانوں میں روز بروز علم کا تنزل ہو رہا ہے جس کی وجہ سے خود علم دین بھی معدوم ہوتا جاتا ہے۔ علوم دینیہ کا صرف جاننا نہ کچھ عبادت ہے اور نہ کچھ ثواب۔ البتہ وہ اس وقت عبادت یا ثواب ہو سکتا ہے جب کہ اس کو امور دینی کے کام میں لانے کی نیت سے پڑھا جاوے۔ پس مدار عبادت و ثواب نیت پر رہا نہ کہ نفس علم پر۔ اور یہی حال تمام باقی علوم کا ہے۔ وہ تمام علوم جن کو دنیوی کہتے ہیں ترقی واستحکام اور نقلی علوم دینی کے لئے بھی ضروری ہیں۔ گو ان کا پڑھنا بھی فی نفسہٖ عبادت نہ ہو جیسا کہ علوم دینیہ کا پڑھنا بھی فی نفسہٖ عبادت نہیں ہے مگر جب کہ علوم دنیوی اس نیت سے پڑھے جاویں یا پڑھائے جاویں کہ یہ علوم دینیہ کے لئے مثل آلہ کے ہیں تو ان کا پڑھنا یا پڑھانا بھی ویسا ہی عبادت ہے جیسا کہ علوم دینیہ کا ہے۔

علاوہ اس کے علوم دنیوی بھی اگر ان کی تعلیم نیک طرح پر ہو تو باعث ترقی ایمان ہوتے ہیں۔ ہم ریاضی پڑھ کر خدا تعالیٰ کی اس قدرتِ کاملہ سے واقف ہیں جو خلقِ آسمان و زمین و کواکب و سیارہ و ثوابت میں کام آتی ہے۔ جس وقت ہم علم ارض پڑھتے ہیں تو ان عجائبات سے واقف ہوتے ہیں تو پھولوں کی پنکھڑیوں کی رنگ آمیزی اور مکھی کی آنکھ کی پچی کاری ہم کو حکیم مطلق کی حکمتِ کاملہ پر یقین دلاتی ہے۔ اسی طرح تمام علوم ہماری معرفت کو قوت بخشتے اور خدائے واحد پر ہمارے ایمان کو اور مستحکم کرتے ہیں اور اس اعتبار سے اگر ہم ان علوم کو بھی علوم دینیہ میں شامل سمجھیں تو کچھ بعید نہیں۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو ایسا عمدہ مذہب دیا ہے جو ہمارے معاد و معاش دونوں کو قانون قدرت کے مطابق اصلاح کرنے اور ترقی دینے والا ہے۔ ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر تمام لوگ صرف علوم دنیوی کی تحصیل کریں تو دین کا کیا حال ہوگا۔ اسی طرح یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر تمام لوگ صرف علوم دینی پڑھا کریں تو ہماری دنیا کا جس کی اصلاح شریعت سے

خارج نہیں ہے۔ کیا حال ہوگا۔ علوم دنیاوی کے معدوم ہونے سے دین اور علوم دینی دونوں کے معدوم ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ہم دونوں قسم کے علوم کی ترویج پر سعی و کوشش کریں۔ اور ایک کو دوسرے کا آلہ سمجھ کر دونوں کو پڑھنا اور پڑھانا داخلِ عبادت جانیں۔"

ثواب اور اس کا مقصد

مسلمانوں کا ایک اور عقیدہ جس کو سرسید معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لئے بدلنا چاہتے تھے۔ ثواب کا غلط تصور تھا۔ چند ایسے کام تھے جن کو کرنا مسلمانوں کے خیال میں کارِ ثواب تھا اور مسلمان یہ سمجھ کر ثواب کے یہ کام انجام دیتے تھے کہ اس کے بدلے میں ان کو جنت مل جائے گی۔ سرسید کے نزدیک ثواب کا یہ تصور بہت محدود، غلط اور خود غرضی پر مبنی تھا۔ اور انہوں نے اس خیال کو بدلنے کی کوشش کی۔ عام طور سے ثواب کے جو غلط معنی لئے جاتے تھے ان کو واضح کرتے ہوئے سرسید نے یہ بتلایا کہ جب ہم پچھلے زمانے پر نظر کرتے ہیں تو قومی ہمدردی کی بہت سی نشانیاں پاتے ہیں۔ ہر طرف ہزاروں کھنڈرات، مسجدوں، پلوں، کنوؤں اور مہمان سراؤں کے نظر آتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے لگا کر لوگوں نے مہمان سرائیں بنوائیں۔ کنوئیں کھدوائے اور پل بنوائے۔ سنہری مسجدیں بنوائیں جن کے بڑے بڑے برج سونے کے کام سے منڈھے تھے۔ سنگ مرمر کی مسجدیں بنوائیں جو موتی مسجد کے نام سے مشہور ہوئیں۔ بڑی بڑی عالیشان خانقاہیں بھی تعمیر کیں جن کے نشانات اب بھی پائے جاتے ہیں لیکن مدرسوں کے کچھ زیادہ نشانات نہیں ملتے۔ تاہم کئی مدرسے بھی قائم کئے گئے جن کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے اور کئی مدارس اب بھی جاری ہیں۔ یہ آثار دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہم لوگوں میں قومی ہمدردی قدیم سے چلی آتی ہے لیکن جب زیادہ غور کرتے ہیں تو سب دھوکہ ہی دھوکہ نظر آتا ہے۔ جنہوں نے یہ کام کئے اور کر رہے ہیں۔ ان کے دل سے پوچھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب کام اس خیالی جوش میں کئے ہیں کہ ہم ثواب کے کام میں مصروف ہیں اور ثواب کی گٹھڑیاں باندھ رہے ہیں۔ سمجھتے ہیں یہ سب کام ہم کو بہشت میں لے جاویں گے۔ اور بہشت میں ہم بڑے بڑے درجے پاویں گے۔ ہمارے سر پر تاج ہوگا اور ایک موتی کا محل جنت میں ملے گا۔ حوریں تصرف کو ہوں گی جن کو ہمارے سوا کسی نے چھوا بھی نہ ہوگا۔ پھر ان کی تعداد چار پر بھی محدود نہ ہوگی۔ بے انتہا جتنی چاہو۔ غلمان بھی نہایت خوبصورت ہوں گے۔ باغ ہوگا۔ میوہ ہوگا۔ نہریں ہوں گی۔ شراب ہوگی۔ پئیں گے اور چین کریں گے۔" بہشت میں یہ عیش و عشرت حاصل کرنے کے لئے جو کام کئے جاتے ہیں سرسید نے ان کو قومی ہمدردی کے بجائے خود غرضی اور بالکل ایسے ہی کام قرار دیا ہے جیسے کہ ایک رند مشرب دنیا میں اپنی عیشوں کو حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے اگر باغبانوں کو مزدوری دے کر اپنے چین کے باغ لگوانا۔ مزدوروں کو مزدوری دے کر اپنے آرام کے لئے محل بنوانا اور کلال کو دام دے کر اپنی عیاشی کے لئے شراب کھنچوانا قومی ہمدردی اور کارِ ثواب نہیں ہے تو پھر وہ کام جو جنت میں عیش کرنے کی غرض سے کئے

جانتے ہیں قومی ہمدردی اور ثواب کے کام کیسے ہو سکتے ہیں۔

ثواب کے کاموں کو مسجدوں، خانقاہوں اور تالابوں کی تعمیر تک محدود رکھنے اور جنت میں عیش کرنے کی غرض سے یہ کام کرنے کے رجحان کو بدل کر قوم کی فلاح و ترقی کے لئے تمام ضروری کام انجام دینے پر لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے سر سید نے یہ بتلایا کہ اسلام کا صحیح مسئلہ یہ ہے کہ اس کام کے کرنے میں ثواب ہے جس کی ضرورت ہے۔ دیکھو کوئی اجر ہجرت سے زیادہ نہ تھا جس کی اس وقت بڑی ضرورت تھی مگر فتح مکہ کے بعد اس کا اجر کچھ بھی نہ تھا۔ جیش اسامہ کی تجہیز کے لئے جو چار ٹکے کا اسباب ابو بکر صدیق رضؓ نے حاضر کیا جس کی ضرورت تھی مگر اب اس کی برابری کوہ احد کے برابر سونا بھی نہیں کر سکتا۔ یہی سچا اصول مذہب اسلام کا ہے۔

ثواب کے کام

مسلمانوں میں، ایسے لوگ بھی تھے جو خدمت خلق کو نیکی اور ثواب کا کام سمجھتے تھے، اور نیک کام کرنے کی امکانی کوشش اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کرتے تھے۔ لیکن ان لوگوں کا نیکی اور خیر کا تصور چونکہ بہت محدود تھا اس لئے وہ قوم کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری امور اور خدمت خلق کے زیادہ اہم اور ضروری پہلوؤں پر توجہ نہ کرتے تھے۔ ان کے خیال میں ثواب کے کام بس اسی حد تک محدود تھے کہ مسجدیں بنوا دیں، لوگوں کے آرام کے لئے کنوئیں کھدوا دیں اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال نے مسلمانوں کو جن مشکلات میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کے بگڑے ہوئے حالات نے معاشرتی اصلاح، اقتصادی بہتری اور قومی ترقی کے لئے جن مسائل کو حل کرنا ناگزیر بنا دیا تھا ان پر قابو پانے کی تدبیریں ان کی نظر میں نہ تو نیکی اور ثواب تھیں اور نہ خدمت خلق۔ سر سید یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اس حقیقت کو محسوس کریں کہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے مختلف شعبوں میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے وجود کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں اور اس زمانے میں سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑا ثواب کا کام قوم کی خدمت کرنا اور اس کو تباہی و بربادی سے بچانے میں مدد دینا ہے۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کے دل میں یہ خیال بٹھانے کی کوشش کی کہ نیکی بلاشبہ نیک ہے۔ اور ہمیشہ رہنے والی نیکی سب نیکیوں سے افضل و اعلیٰ ہوتی ہے۔ انسانوں میں نیک وہ ہے جو بہت سی نیکیاں کرے مگر سب سے زیادہ نیک وہ ہوگا جس کی نیکیاں سب سے زیادہ افضل اور اعلیٰ ہوں۔ بعض لوگوں نے پل، مسجدیں، اور کنوئیں بنوائے اور ان چند روزہ رہنے والی نیکیوں کو خیر دائم سمجھ لیا۔ بعض لوگوں نے خیر خیرات میں زہد و تقویٰ اور عبادت کو خیر دائم خیال کیا لیکن ان کی یہ نیکیاں خیر دائم نہیں بلکہ چند روزہ ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جاوے اور ٹھیک سمجھا جاوے تو بجز رفاہ عام اور انسان کی بھلائی چاہنے کے اور کوئی نیکی خیر دائم نہیں ہے۔ انسان کی بھلائی نہ تو نیکی کرنے والے کی موت سے ختم ہوتی ہے اور نہ اس زمانے کے انسانوں کے

فنا ہونے سے فنا ہو جاتی ہے بلکہ نسل در نسل اور پشت در پشت آئندہ انسانوں میں چلی آتی ہے اور قیام دنیا تک دائم رہتی ہے۔ اس لئے صرف یہی ایک نیکی ہے جس کو خیر دائم کہہ سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی بھلائی چاہنے کی خدمت انبیاء کو عطا کی۔ پس انسان کی بھلائی میں سعی کرنا انبیاء کا ورثہ لینا ہے اور تمام نیکیوں میں سے افضل اور اعلیٰ نیکی کا اختیار کرنا ہے۔ پس فلاح عام کے کاموں کو عبادات دینی میں سے نہ سمجھنا اور صرف نوافل اور تسبیح و تہلیل کو عبادت جاننا بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ خیر دائم اور بھی زیادہ نیک اس وقت ہو جاتی ہے جب اس کی ضرورت ہو۔ اور موجودہ زمانے میں اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے اس کی بہت ضرورت ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ صرف تسبیح و تہلیل اور زہد و تقویٰ ہی پر تکیہ نہ کریں اور صرف ادائے زکوٰۃ اور قضائے دیون ہی پر اقتصار نہ کریں بلکہ تھوڑا سا وقت اور دو چار درہم رفاہ و فلاح حال مسلمانان کے لئے بھی نکالیں اور خیر دائم کی نیکی کو بھی حاصل کریں۔

سرسید کو اپنی قوم کی اصلاح و ترقی کی کوششوں میں جو رکاوٹیں پیش آ رہی تھیں ان کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مسلمان اس کارِ خیر کو محض ایک دنیاوی معاملہ سمجھتے تھے۔ اور اس کو اپنا دینی فرض اور افضل و اعلیٰ نیکی خیال نہ کرتے تھے۔ سرسید کو اپنی مشکلات کا احساس تھا اور وہ ان کو دور کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مدرسۃ العلوم کی امداد کے سلسلے میں مولوی محمد علی حسن خان کو لکھا تھا کہ ایک عام خیال نسبت حسنات و خیرات و مبرات کے محدود ہو گیا ہے۔ اس خیال کو توڑنا اور یہ بات دل میں ڈالنی کہ درحقیقت جس امر کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اور جس کے نہ ہونے سے مسلمانوں کی روز بروز ذلت ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ اسلام کی بھی ذلت ہے۔ اس میں تائید کرنا اور اس ذلت سے مسلمانوں کو نکالنا سب سے بڑی حسنات میں شامل ہیں۔

تقلید پرستی

اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ دنیا کی تمام قوموں کے لئے ہے اور ہر ملک اور ہر زمانے کے لئے ہے۔ جو مذہب اس قدر ہمہ گیر، آفاقی اور دائمی ہو اس کو مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں نئے نئے مسائل حل کرنا ہوگا۔ اور زمانے کے تقاضوں کو دینی اصول و مقاصد سے ہم آہنگ کرنا پڑے گا۔ ورنہ انسانی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگی اور زمانے کا ساتھ نہ دینے والا مذہب محض بے جان عقائد کا مجموعہ بن کر غیر مؤثر ہو جائے گا۔ اسلام نے انسانی معاشرہ کی اسی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر مسلمانوں کو اجتہاد کرنے کا اختیار دیا ہے تاکہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے زمانے کے نئے نئے تقاضوں کو پورا کر سکیں اور اسلامی معاشرہ کی ترقی میں رکاوٹیں حائل نہ ہوں۔ لیکن جب مسلمان زوال پذیر ہو گئے تو انہوں نے اجتہاد کو ترک کر کے محض تقلید کا طریقہ اختیار کر لیا اور یہ فرض کرنے لگے کہ اجتہاد کی آزادی تو اماموں پر ختم ہو گئی ان کے بعد اجتہاد کی مطلق گنجائش نہیں اور اب مسلمانوں کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ کسی امام کی تقلید کریں۔

تقلید کے اس غلط تصور نے اسلامی معاشرہ کی ترقی کو روک دیا اور وہ زوال پذیر ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس کی حالت انتہائی پست ہوگئی اور مسلمانان عالم سے بہت دور ہوگئے۔

سرسید کے خیال میں مسلمانوں میں تقلید کا یہ رجحان ان کی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ اور ان کے زوال وادبار کا ذمہ دار تھا۔ وہ اماموں کا احترام کرتے تھے لیکن یہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے کہ انہوں نے جو رائے قائم کی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ اور ہمیشہ اسی رائے پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اجتہاد کا دروازہ بند کرکے محض تقلید کرتے رہنے سے مسلمانوں اور اسلام کو بہت نقصان پہنچاہے۔ اور یہ بہت ضروری ہے کہ مسلمان تقلید کے بارے میں اپنا نظریہ بدل دیں۔ چنانچہ محسن الملک کے نام ایک خط میں انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن وحدیث سے صحیح حاصل ہوتی ہے تلاش نہ کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کرسکیں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔ اسی خیر خواہی نے مجھ کو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پروا نہیں کرتا۔ ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لئے اور بہشت میں داخل ہونے کے لئے ائمہ کبار در کنار مولوی جو کی بھی تقلید کافی ہے۔ کیونکہ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ لینا ہی ایک ایسی طہارت ہے کہ کوئی نجاست باقی نہیں رہتی۔ پس میں دشمن اسلام ہوں یا مثل ابوبکرؓ و عمرؓ کے دوست اسلام جیسا میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ سچے اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زہر قاتل ہے۔ بلاشبہ ہم نے علماء کو مثل یہود و نصاریٰ کے ارباب من دون اللہ سمجھ لیا ہے۔ خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچائے۔"

سرسید اسلام اور مسلمانوں کی بقا و ترقی کے لئے اجتہاد کو لازمی خیال کرتے تھے اور ان کی رائے یہ تھی کہ متاخرین اہل سنت و جماعت نے عجیب غلط مسئلہ بنایا ہے کہ اجتہاد ختم ہوگیا اور اب کوئی مجتہد نہیں ہوسکتا۔ اکثر علمائے دین کا یہ مذہب ہے کہ ہر زمانے میں مجتہد کا ہونا ضروری ہے۔ پس کیسی بڑی غلطی اہل سنت والجماعت کی ہے کہ اجتہاد کو ختم اور مجتہد کو معدوم مانتے ہیں اسی غلط اعتقاد نے مسلمانوں کو دین و دنیا میں نہایت نقصان پہنچایا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس خیال کو چھوڑ دیں اور ہر بات کی تحقیق پر مستعد ہوں خواہ وہ بات دین کی ہو یا دنیا کی۔ غور کرنا چاہیئے کہ ہر گاہ زمانہ حادث ہے اور نئے نئے امور اور نئی نئی حاجتیں ہم کو پیش آتی ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس زندہ مجتہد موجود نہ ہوں گے تو ہم مردہ مجتہدوں سے نئی بات کا مسئلہ جوان کے زمانے میں حادث بھی نہیں ہوئی تھی کیونکر پوچھیں گے۔ پس ہمارے لئے بھی مجتہد العصر والزمان ہونا ضروری ہے۔" جو لوگ ائمہ کبار کے اجتہاد کو حرف آخر سمجھتے ہیں اور ہر حال اور ہر زمانے میں ان کی تقلید کرنے کے قائل ہیں وہ لوگ سرسید کے نزدیک گمراہی میں مبتلا ہیں۔ اور ان کا یہ غلط عقیدہ ائمہ کو وہ مرتبہ

دنیا جاتا ہے جو صرف رسول کے لئے ہے۔ کیونکہ ان کا یہ خیال ہے کہ جس طرح خدا کو اپنی ذات و صفات میں وحدت ہے اسی طرح رسول کو تبلیغ احکام یا احکام شریعت کے قرار دینے میں وحدت ہے۔ اور کسی کو اس میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ پس جو شخص رسول کے سوا کسی اور شخص کے احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح پر واجب العمل سمجھتا ہے کہ اس کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اس کی تابعداری کو باعث نجات یا ثواب سمجھتا ہے وہ بھی ایک قسم کا شرک کرتا ہے جس کو شرک فی النبوۃ سے تعبیر کرتا ہوں۔"

سرسید نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کو دینی گمراہی سے بچانے اور اصلاح و ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے ان کے عقائد درست کرنے کی جو کوششیں کیں وہ مسلمانوں میں ایک فکری و ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی بنیاد بن گئیں۔ اور جدید دینی افکار کی تشکیل میں سرسید کے نظریات نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی۔

(بہ شکریہ ثقافت لاہور)

طلوعِ اسلام (حاشیہ ملت)

سرسیدؒ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس کے اصول فطرت (نیچر) کے عین مطابق ہیں۔ اس وجہ سے مخالفین انہیں نیچری کہہ کر پکارتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ سرسید کی نگہ ژرف بیں نے دیکھ لیا تھا کہ اقوامِ مغرب، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے باقی دنیا کو بالعموم اور مسلمانوں کی دنیا کو بالخصوص اپنے تابع فرمان بنائے جا رہی ہیں اور مسلمانوں کو صدیوں سے یہ غلط سبق دیا جا رہا ہے کہ دنیا قابلِ نفرت ہے اور اس کے ترک کر دینے میں ہی انسان کی نجات ہے۔ وہ مسلمانوں کو اس ذلت آفریں تعلیم کے شکنجہ سے نکال کر تسخیرِ فطرت کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے فطرت پر اس قدر زور دیتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ کبھی کبھی "انسانی فطرت" کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ درست نہیں جیسا کہ طلوعِ اسلام میں متعدد بار اس حقیقت کو پیش کیا جا چکا ہے۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ اس میں کچھ صلاحیتیں ہیں جن کی نشوونما کر کے ان سے حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کام لینا اسلام ہے۔ (تفصیل ان امور کی سلیم کے نام خطوط میں ملے گی) لہٰذا سرسیدؒ کے ہاں جہاں فطرت کا لفظ آئے وہاں اس سے مراد قوانینِ فطرت یا فطرت کی قوتیں لی جانی چاہئیں۔ اسے انسانی فطرت پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔

بچوں کا صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ننھی طاہرہ بچیوں کی طرف سے مسلسل تقاضے ہو رہے ہیں کہ طلوع اسلام میں ان کے لئے بھی کچھ لکھا جایا کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک طاہرہ بچی کا خط جولائی کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے حوالے سے بعض مقامات سے ہمیں مضامین بھی موصول ہوئے ہیں۔ بچوں کے لئے لکھنا بظاہر جس قدر آسان نظر آتا ہے درحقیقت یہ اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ بالخصوص جب مقصد پیشِ نظر یہ ہو کہ بچوں کے ذہن میں صحیح قرآنی تصورات منقوش کئے جائیں۔ ہمارے خیال میں یہ مضامین جس انداز کے ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے ہم ذیل میں ایک مضمون درج کرتے ہیں جو "بجنہ کے سجائی جان" کا لکھا ہوا ہے اور اس سلسلے میں ہم ان احباب سے، جنہوں نے بچوں کی نفسیات کا مطالعہ کیا ہے اور جو ان کی تعلیم اور تربیت کے کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں، درخواست کریں گے کہ وہ ہمیں اپنے مشوروں سے مستفید فرمائیں۔ تاکہ طلوع اسلام کا سب سے اہم گوشہ ابتدا سے ہی صحیح خطوط پر متشکل ہو سکے۔

(مدیر)

اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

نجمہ بہت ذہین بچی تھی۔ جو بات ایک بار سُن لیتی وہ جیسے ہمیشہ کے لئے اسے یاد ہو جاتی۔ جس سے ایک بار مل لیتی، اس کا چہرہ اور نام کبھی نہ بھولتی۔ پڑھنے میں بھی وہ بہت تیز تھی۔ اپنے درجہ میں ہمیشہ اوّل آتی۔ اُسے اپنی کتابوں کے کتنے ہی سبق اور نظمیں زبانی یاد ہو گئی تھیں۔

نجمہ کو اپنے حافظہ پر بڑا غرور ہو گیا۔ اس نے محنت سے اپنے کورس کی کتابیں پڑھنی چھوڑ دیں۔ ہر وقت قصّہ کہانی کی کتابیں اور رسالے پڑھتی رہتی۔ اسے یقین تھا کہ امتحان کے قریب وہ چند دنوں میں اپنا سارا کورس ختم کر لے گی۔

آخر امتحان سر پر آ گیا۔ اب نجمہ تھی اور کورس کی ڈھیر ساری کتابیں۔ تاریخ، جغرافیہ، انگریزی، اردو، حساب، جنرل سائنس۔ نجمہ نے سب کتابیں یاد کرنے کی کوشش کی۔ مگر تم جانو، آٹھویں جماعت کا کورس اتنا آسان تو ہوتا نہیں کہ دس بارہ دن میں پڑھ کر کوئی پاس ہو جائے۔

امتحان ہوا۔ نجمہ کے پرچے اچھے نہ ہوئے۔

چند دنوں کے بعد نتیجہ نکل آیا اور ہمیشہ اوّل آنے والی نجمہ فیل ہو گئی۔ سب ہی کو بہت تعجب ہوا کہ "آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" مگر ہونے والی بات تو ہو چکی تھی۔ نجمہ بہت اُداس رہنے لگی۔ وہ اپنے کمرے سے بھی باہر نہ نکلتی۔ آخر اس کی امّی اور ابّو نے اسے بہت سمجھایا کہ "غم نہ کرو۔ صبر کرو۔ انشاءاللہ اگلے سال پاس ہو جاؤ گی۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

نجمہ کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ آخر صبر کرنے سے کوئی پاس کیسے ہو سکتا ہے؟ ــــ یا صبر کرنے سے دوسرے کام کیسے ہو سکتے ہیں؟ نجمہ کے ذہن میں بہت اُلجھن پیدا ہو گئی۔ ایسی اُلجھن جو سُلجھنے کا نام نہ لیتی تھی۔

ایک دن نجمہ کے ماموں کراچی سے لاہور آئے نجمہ کو اپنے ماموں سے بہت پیار تھا۔ وہ بہت خوش ہوئی اور اس خوشی میں اپنے فیل ہونے کا غم بھول گئی۔ ماموں نے نجمہ کو خوب سیر کرائی۔ جہانگیر کا مقبرہ، بادشاہی مسجد، شالامار، باغِ جناح۔

اور جب اتوار آیا تو انھوں نے صبح ہی صبح نجمہ سے کہا "بیٹی آٹھ بجے تک تیار ہو جانا۔ آج ہم درسِ قرآن سننے چلیں گے۔ قرآن مجید اللہ میاں کی کتاب ہے۔ اس کتاب کی اچھی اچھی اور پیاری پیاری

باتیں سمجھ کر اور ان پر عمل کر کے ہم بڑی ترقی کر سکتے ہیں۔ یہی ہماری بڑائی کا اکیلا راستہ ہے۔ آج مسلمان دُنیا کی دوسری قوموں سے کتنا پیچھے رہ گئے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ اب وہ قرآن مجید سے اپنی زندگی کے لئے روشنی حاصل نہیں کرتے۔"

آٹھ بجے نجمہ اپنے ماموں کے ساتھ ٹیکسی میں درسِ قرآن سننے کے لئے روانہ ہوگئی۔ ٹیکسی گلبرگ مارکیٹ سے گزر کر پانی کی ٹنکی کے سامنے ایک اچھے مکان کے سامنے رُکی۔ نجمہ کے ماموں نے کرایہ ادا کیا۔ اور دونوں اس مکان کے اندر داخل ہوگئے۔ نجمہ نے دیکھا کہ مکان کے سامنے کے رُخ پر ایک بورڈ لگا ہے

"طلوعِ اسلام"

نجمہ اندر جا کر عورتوں اور اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ جو صاحب درسِ قرآن دیتے ہیں، انہیں یہ سب لوگ "باباجی" کہتے ہیں نجمہ سوچنے لگی کہ یہ صاحب سب سے بہت محبت کرتے ہوں گے جبھی تو سب لوگ انہیں "باباجی" کہتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ساڑھے آٹھ بجے درسِ قرآن شروع ہوا۔ باباجی نے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کہہ کر اپنی تقریر شروع کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی نجمہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ باباجی تو "صبر" کے بارے ہی میں تقریر کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ قرآن مجید کی روشنی میں صبر کسے کہتے ہیں۔

باباجی نے بتایا کہ عربی زبان میں "صبر" کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنے کام کو پورا کرنے کیلئے برابر محنت کرتا رہے۔ لگاتار کوشش اور اپنے مقصد پر مضبوطی سے جمے رہنے کو صبر کہتے ہیں۔ اسی لئے پہاڑ کو "الصّبیر" کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے جما کھڑا رہتا ہے۔

نجمہ بہت پڑھی لکھی تو نہ تھی کہ باباجی بڑوں کو جو باتیں سمجھا رہے تھے وہ سب اس کی سمجھ میں آجاتیں مگر اس نے بڑے غور سے تقریر سنی اور صبر کے سچے اور اصلی معنی اس کی سمجھ میں آگئے۔ باباجی نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پاک ساتھیوں کی مثال دے کر بتایا کہ یہ سچے صبر والے جو اللہ کے راستے پر مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ مشکلیں آئیں، مخالفین نے جنگیں کیں مگر نہ تو ان لوگوں میں کمزوری آئی اور نہ ان کے قدم سُست پڑے۔

جب تقریر ختم ہوئی تو جیسے نجمہ کے ذہن کی اُلجھن دور ہوگئی اور یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ

"اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"

گھر واپس جاتے ہوئے نجمہ نے اپنے ماموں سے کہا کہ "ماموں جی! اب میں بہت محنت سے پڑھوں گی یہی تو صبر ہے۔ مگر زیادہ تر لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ جب کسی آدمی کے غلط کاموں کا بُرا نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے تو اس سے کہتے ہیں صبر کرو۔ آخر ایسے صبر سے کیا ہو سکتا ہے۔ توبہ توبہ"

ماموں ہنس پڑے اور پھر سنجیدہ ہوگئے۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کہنے لگے بیٹی! مسلمانوں کی تباہی کی وجہ یہی تو ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ تو باقی رہ گئے ہیں مگر ان کے معنی بدل گئے ہیں۔ میری بیٹی! تم محنت سے پڑھو اور قرآن مجید کو اپنا ساتھی بنا لو۔ یوں تمہاری زندگی بھی سنور جائے گی اور تمہارے آس پاس والوں کی بھی"

رابطۂ باہمی

(بزمہائے طلوع اسلام کی ماہانہ رپورٹیں)

کراچی

بزم کا ماہانہ جلسہ شیخ محمد شفیع صاحب کے مکان پر ۳ راگست ۱۹۶۳ء کو ہوا۔ چالیس ارکان نے شرکت کی۔ طے پایا کہ ۱۲ اگست کو دن میں درس قرآن کی بجائے محترم پرویز صاحب کی ٹیپ شدہ تقریر "شہنشاہ جبیا لٹیں" سنائی جائے اور رات کو عید میلاد النبیؐ شیخ صاحب موصوف کے مکان پر منائی جائے۔ تقریب کا پروگرام یہ طے پایا کہ تلاوت اور نعت کے بعد ارکانِ بزم دس دس منٹ کی تقریریں ایک گھنٹہ تک سیرتِ نبویؐ پر کریں اور پھر حاضرین کو کھانا کھلایا جائے اور کھانے کے دوران میں کلام اقبالؒ کے ریکارڈ سنائے جائیں۔ چنانچہ اعلان کر دیا گیا کہ بزم کے اراکین اور شرکاء درس کھانے میں مزید شریک ہوں۔ تقریب کے جملہ اخراجات عقیدت مندان بارگاہ نبویؐ کی فراخدلی سے پورے ہوئے۔ شرکت کے لئے دیدہ زیب دعوت نامے تقسیم کئے گئے۔

حسب پروگرام ۱۲ اگست کو دن میں "شہنشاہ جبیا لٹیں" ٹیپ پر سنایا گیا اور رات کو عید میلاد النبیؐ منائی گئی مقررہ وقت پر شام کو مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ شیخ صاحب کے مکان کو قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ نشست کے لئے کرسیوں کا انتظام تھا۔ اسٹیج پر مائک اور لاؤڈ سپیکر بھی موجود تھے۔ زیر صدارت عبدالرب صاحب کارروائی شروع ہوئی۔ حافظ برکت اللہ صاحب نے سورۂ فتح کے آخری رکوع کی تلاوت کی اور اس کا مفہوم بتایا۔ ایک خورد سال بچے محمد رفیق نے سورۂ فاتحہ کا منظوم ترجمہ سنایا۔ سلامت علی صاحب نے نعت پڑھی اور ضیا رضا صاحب نے کلام اقبالؒ پڑھا اس کے بعد تقریریں شروع ہوئیں۔ عبدالمجید خاں صاحب نے منصب رسالت۔ گلزار حسین صاحب نے قرآن کی اولین مخاطب قوم کے حسن و قبح، محمد صدیق قریشی صاحب نے علم و حکمت۔ محمد اسلام صاحب نے منصب رسالت خالد سلام صاحب نے حریت فکر اور محمد شفیع صاحب نے "انا بشر مثلکم" کے عنوانات پر تقاریر کیں جو بڑی دلچسپی سے سنی گئیں۔ ایک صاحب نے اطمینان ظاہر کیا کہ مجمع عمر رسیدہ لوگوں کے بجائے جوانوں پر مشتمل تھا۔ جن کی

تقاریر نے واضح کر دیا کہ قرآن نے جوانانِ قوم کے دل میں جگہ کرلی ہے اور پرویز کی کوششیں بار آور ہو رہی ہیں۔ آخر میں صدر جلسہ نے اسوۂ نبویؐ اور تعمیر سیرت پر مختصر خطاب کیا۔ تقریب میں خواتین کی بڑی تعداد شامل تھی۔ تقریب نہایت کامیاب رہی۔ شرکاء کی تعداد تین سو کے قریب تھی۔

لاہور بزم کا ماہانہ اجتماع مورخہ ۴ اگست سنہ ۶۳ء بروز اتوار نمائندہ بزم مرزا محمد خلیل صاحب کے مکان پر منعقد ہوا۔ اراکین نے خاصی تعداد میں شرکت کی۔ اس اجتماع میں درج ذیل اہم فیصلے ہوئے:-

(۱) ادارہ سے سفارش کی جائے کہ محترم پرویز صاحب کے ہفتہ وار درسِ قرآن میں ہر ماہ ایک نشست "استفسارات" کے لئے مخصوص کر دی جائے۔

(۲) رسالہ طلوع اسلام کی خریداری بڑھانے کے سلسلہ میں اراکین نے اپنے طور پر چند رسالے خریدنے کا عزم کیا جو قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے احباب تک پہنچائے جائیں گے۔

(۳) نیا پمفلٹ "علماء کون ہیں" ایک ہزار کی تعداد میں خریدنے کا فیصلہ کیا گیا۔

(۴) ہفتہ وار درسِ قرآن کے انتظامی امور کے سلسلے میں "درس کمیٹی" اور اخبارات و پریس سے رابطہ استوار کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔

(۵) بزم کی کارکردگی بہتر بنانے کے لئے ہر رکن نے عہد کیا کہ وہ اس بارے میں مؤثر تجاویز بزم کے سامنے لائیگا۔

۶۔ اراکین بزم میں گہرا تعاون پیدا کرنے کے سلسلے میں فیصلہ ہوا کہ اگر کسی رکن کو کسی قسم کی کوئی مصیبت یا پریشانی لاحق ہو تو دیگر اراکین اسے رفع کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

۷۔ رسالہ طلوع اسلام کے لئے اشتہار حاصل کرنے کے لئے اراکین پوری پوری کوشش کریں۔ بزم کے ایک رکن نے ایک صفحہ کا مستقل اشتہار دلانے کا وعدہ کیا۔

۸۔ طے پایا کہ بزم کے اجتماعات کو بیش از بیش کامیاب بنانے کے لئے ان کے انعقاد کا اعلان مختلف اخبارات میں حوالۂ اشاعت کیا جائے۔

ڈھاکہ قرآنی فکر سے متعلق احباب کا سلسلہ تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ درسِ قرآن کے اجتماعات کے علاوہ بزم کی ماہانہ مجالس کا الگ انتظام کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ۲ اگست کو محترم شہاب صاحب کے مکان پر بزم کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں قرآنی فکر کو عام کرنے کے سلسلے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ میزان پبلیکیشنز کی ایجنسی کا قیام عمل میں لایا جائے اور ماہنامہ طلوع اسلام کے لئے مختلف صنعتی اداروں اور فرموں سے اشتہارات حاصل کرنے کی تگ و دو کی جائے۔ انشاء اللہ العزیز یہ کوششیں جلد رنگ لائیں گی۔

جشن میلاد النبیؐ کے سلسلے میں ایک خصوصی تقریب منعقد ہوئی۔ اخبارات میں اس کے متعلق اعلان شائع ہوا

اور اہل شوق کی ایک بڑی تعداد نے اس میں شرکت کی۔ شہنشاہ بوریا نشین کے عنوان سے مفکر قرآن کی ٹیپ شدہ تقریر نے حاضرین پر وجد طاری کر دیا۔ پوری مجلس نے اس تقریر کو جذب و انہماک سے سنا اور اس حقیقت کی برملا شہادت دی کہ ایسے منکر قرآن اور دشمنان رسالت کے خلاف مخالفین کا پروپیگنڈہ کذب و افترا کے سوا کچھ نہیں۔ سب کے لبوں سے مسلسل تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوتی رہیں اور اس بصیرت افروز تقریر نے دلوں میں گہرا اثر پیدا کیا۔ نمائندہ بزم محترم عبدالحلیم صاحب کے مضامین یہاں کے بنگلہ اور انگریزی اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان مضامین کو یہاں کے اہل فکر اور صاحب علم طبقہ میں خوب پسند کیا جا رہا ہے۔ بالخصوص کالجوں کے نوجوان طلباء ان سے گہری دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے خریداران طلوع اسلام کی فہرست ادارہ سے حاصل کر لی گئی ہے اور ان سے بذریعہ خط و کتابت رابطہ قائم کیا جا رہا ہے۔ یہ مہم کامیابی سے جاری ہے۔ اس کی بدولت خوش آیند نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ اور عنقریب سارا مشرقی پاکستان کی فضا قرآنی فکر کی روشنی سے جگمگا اٹھے گی۔

میانوالی ۲۔ اگست (بروز اتوار) بزم کا اجلاس چوہدری رفیق احمد صاحب ایڈوکیٹ کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں شیخ الفاضل سید نصیر شاہ صاحب نے عائلی قوانین کے موضوع پر ایک بصیرت افروز تقریر ارشاد فرمائی۔ تقریر کے بعد قرآنی فکر کو عام کرنے اور اہل علم تک اس دعوت کو پہنچانے کے لئے موثر اقدامات زیر غور لائے گئے۔ خاتمہ اجلاس پر پمفلٹ بھی تقسیم کئے گئے۔

لوریالہ بزم کے ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں۔ عائلی قوانین سے متعلق پمفلٹ شہر کے اہل فکر و بصیرت طبقہ میں تقسیم کیا گیا۔ ڈھاکہ میں بزم طلوع اسلام کے قیام پر احباب نے دلی مسرت کا اظہار کیا۔ اس مسرت انگیز اقدام کو مشرقی پاکستان میں قرآنی تحریک کے خوش آیند مستقبل کے لئے نیک فال قرار دیا گیا۔ اور بزم ڈھاکہ کے احباب کو ہدیۂ تبریک پیش کیا گیا۔

کوئٹہ بزم کی عملی سرگرمیاں باقاعدگی سے جاری ہیں۔ "عائلی قوانین" اور "غلاف کعبہ" سے متعلق پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ شہر کے اہل علم اصحاب کو بہت سا لٹریچر برائے مطالعہ بھیجا گیا تھا۔ اب بزم کے احباب ان حضرات سے وفد کی صورت میں ملاقاتیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مطالعہ کے بعد جن حضرات سے بھی وفد نے ملاقات کی وہ سب قرآنی فکر کی اس دعوتِ انقلاب کی تائید کر رہے ہیں۔ ان میں ایسے اصحاب بھی ہیں جو ایک مدت پہلے سے ہی طلوع اسلام کے پیش کردہ فکر سے متاثر چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پرویز صاحب کے درس قرآن میں جو بذریعہ ٹیپ سنایا جاتا ہے، بہ مسرت شریک ہوا کریں گے۔ اگست میں محترم پرویز صاحب کے کوئٹہ تشریف لانے کا پروگرام تھا لیکن افسوس کہ ان کی ناسازیٔ طبیعت کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔

لاہور چھاؤنی بزم اپنے ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے سرانجام دے رہی ہے۔ گاہے گاہے بذریعہ

ٹیپ پر پرویز صاحب کی تقاریر بھی سنائی جاتی ہیں۔ اور اس موقع پر لٹریچر بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ حاضری دن بدن بڑھ رہی ہے۔ چوہدری محمد اشرف صاحب کے گوجرانوالہ میں منتقل ہو جانے کے باعث محترم امیرالدین صاحب بزم کے نئے نمائندہ مقرر ہوئے ہیں۔ بزم نے محترم خالد الزماں کے ہاں اپنا دارالمطالعہ بھی قائم کر لیا ہے اور ہر شام یہاں بہت سے حضرات طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب کی دعوتِ قرآنی کے مطالعہ سے مستفید ہوتے ہیں۔

جس طرح تاج محل آج بھی اسی طرح تر و تازہ اور شگفتہ و شاداب ہے جس طرح آج سے تین سو سال پہلے اسی طرح بعض کتابیں بھی زندہ رہنے والی ہوتی ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے اس کی قدر و قیمت بڑھتی جاتی ہے۔

محترم پرویز صاحب کی زندۂ جاوید تصانیف

سلیم کے نام خطوط

اور

انسان نے کیا سوچا؟

ہیں

جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں ان کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ ان کتابوں نے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں صحیح انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

سلیم کے نام خطوط (تین خوبصورت جلدوں میں) جلد اول ۸ روپے جلد دوم ۶ روپے جلد سوم ۶ روپے

انسان نے کیا سوچا؟ ——— قیمت ۱۲ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

پٹ سن کی مصنوعات تیار کرنے والوں میں

★ ایک ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل ★

لطیف باوانی جوٹ ملز لمیٹڈ
ڈھاکہ

اس ادارہ کے تیار کردہ تھیلے، بوریاں، سوتلیاں اور ٹاٹ کی دیگر اشیاء دکینواس دنیا کے مختلف گوشوں میں بھیجے جاتے ہیں، اور دنیا کے ہر حصے میں ویسے ہی مقبول عام ہیں جیسے اپنے گھر میں۔

مینیجنگ ایجنٹس :-

احمد برادرز لمیٹڈ ۳۵-۳۶- جناح ایوینیو
رمنا - ڈھاکہ ۲

تار کا پتہ - "باوانی" ———— فون نمبر ۲-۳۱-۶۷

کراچی آفس ———— بینک ہاؤس حبیب اسکوائر بندر روڈ کراچی

معاشی مسئلہ نوعِ انسانی کی تاریخ کا عظیم ترین مسئلہ قرار پا چکا ہے۔ عہدِ حاضر کے مفکرین نے اسے حل کرنے کے لئے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ یہ نظریات انسانی ذہن کے تازہ بتازہ تجربات کی پیداوار ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ــــــ

پرویز صاحب کی گرانمایہ تصنیف

نظامِ ربوبیّت

اس مسئلہ کا وہ نکھرا ہوا حل پیش کرتی ہے جو نوعِ انسانی کے لئے بارگاہِ رب العالمین سے عطا فرمودہ آخری کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔ نظامِ ربوبیّت اپنی نوعیت کی بے مثال کتاب ہے۔

رعایتی قیمت ــــــــــ چار روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

انجمن ترقی اردو کا پندرہ روزہ ترجمان

قومی زبان

ایک جریدہ ——— ایک تحریک

جس کا ہر شمارہ

اردو زبان و ادب سے متعلق مسائل اور رفتار ترقی کا آئینہ ہوتا ہے۔

نئے خزانے

ہر ماہ کے اردو اخبارات و رسائل کے علمی و ادبی مضامین کی فہرست۔

اردو کے سپاہی

ایسی معاصر شخصیتوں کے بارے میں مضامین جنہوں نے علمی اور عملی دونوں محاذوں پر اردو زبان کی خدمت کی ہے۔

علمی مسائل

دفتر انجمن میں موصول ہونے والے علمی و ادبی سوالات کے جواب جو مشہور نقاد اور ماہر لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری کے لکھے ہوئے ہیں۔

گرد و پیش

علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں۔

گنج ہائے گراں مایہ

انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں تقریباً دو ہزار مخطوطات ہیں ان کی وضاحتی فہرست جو بالاقساط شائع کی جا رہی ہے۔

علمی اصطلاحات

انجمن کے پاس مختلف علوم و فنون کی تقریباً ایک لاکھ اصطلاحات ہیں جنہیں بالاقساط قومی زبان میں شائع کیا جا رہا ہے۔

نئی مطبوعات

اردو کی نئی مطبوعات کے بارے میں معلومات۔

تبصرے

تازہ مطبوعات پر تفصیلی تبصرے۔

ہر شمارہ تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہوتا ہے

قیمت فی پرچہ پچاس پیسے ——— قیمت سالانہ دس روپے

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو ——— اردو روڈ کراچی

وہ کتاب جس کا مدت سے انتظار تھا

دوبارہ چھپ گئی ہے

پرویز صاحب کے مضامین کا مجموعہ ، مدت ہوئی

فردوسِ گم گشتہ

کے نام سے چھپا تھا لیکن ایک عرصے سے نایاب تھا۔ اب مصنف کی نظرثانی اور نئی ترتیب کے ساتھ اس کا

نیا اڈیشن

شائع ہوگیا ہے۔ اس میں حسب ذیل مضامین شامل ہیں :۔

دُنیا کی نجات۔ جنگ۔ فردوسِ گم گشتہ۔ ایمان بلا عمل۔ اسلام اور سائنس۔ خدا کی بادشاہت۔ اسلام اور مذہبی رواداری۔ تمسک بالکتاب۔ کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟ وراثت ارض کا ابدی قانون۔ قرآن اور تاریخ۔ مسلمان کی زندگی۔ یہ زمین کس کی ہے؟ قرآن کا معاشی نظام۔ اپنی آنکھ اور قرآن کی روشنی۔ نسخہ اور اس کا استعمال۔ خدا اور قیصر۔

ان میں سے ہر مضمون ایک مستقل دعوتِ انقلاب ہے اور یہ قرآنی مفکر گزشتہ پچیس تیس برس سے جن ارتقائی منازل سے گزرا ہے اس کی نشان دہی کرتا ہے۔ عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ جلد منگا لیجئے۔ تقطیع ۸/۲۲×۱۸ ضخامت ساڑھے تین سو صفحات۔ مجلد۔ حسین گردپوش۔ کاغذ سفید۔ قیمت آٹھ روپے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور